من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم

(اقبالؒ)

حکیمُ الامت علامہ اقبال کے بارے میں سردار عبدالقیوم خاں
کے بیانات کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام علی چودھری

اقبال اکادمی پاکستان ◎ لاہور

من اے میرِ امم داد از تو خواہم

(اقبال)

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے بارے میں سردار عبدالقیوم خان کے بیانات کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام علی چودھری

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ——— پروفیسر محمد منورؔ
ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان لاہور

طبع اوّل ——— ۱۹۸۹

مطبع ———

تعداد ——— ۱۰۰۰

قیمت ——— ۴۰ روپے

سیلز آفس : اقبال اکادمی پاکستان - ۱۱۶ میکلوڈ روڈ ——— لاہور

شامی "اقبال مند"

ڈکٹور عبد اللطیف سہیل الخیاط کے نام
جن کی مودّت اور اخلاص نے پہلے میری غربت کو وطن بنائے رکھا
اور اب وطن کو غربت بنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر غلام علی چودھری

فہرست

تقدیم	۵
ونس معاوضہ	۱۹
دو سنگین الزام اور دو عظیم مبلغ	۲۷
کلام اقبال اور علمائے برصغیر	۲۹
اقبال اور بلادِ اسلامیہ	۴۱
قیامت انگیز اثر، ایک رباعی، ایک مصرعہ	۴۵
گمراہ معتبر گواہ	۵۱
"خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی"	۶۰
گالی کی تکنیک	۶۵
اقتدار کی عبرتناک قربان گاہ	۷۳
بات سنتِ رسول کی	۹۱
چند سیدھے سادے سوال	۱۰۳
اہل جموں و کشمیر سے استدعا	۱۱۰
خیرِ کثیر اور طلبِ شہادت	۱۱۱
حواشی	۱۲۰

تقدیم

ڈاکٹر غلام علی چودھری صاحب کی یہ کتاب بہت پہلے آجاتی، مگر ان کا اصرار تھا کہ میں بطور تقدیم اپنی طرف سے بھی چند سطور دوستانہ نشانی کے طور پر شامل کروں۔ میں پوری کوشش کے باوصف وقت نہ نکال سکا یا یوں کہیئے کہ وہ فراغت میسّر نہ آسکی جس میں کوئی بات دل جمعی کے ساتھ قلمبند کی جاسکتی ہو ـــــ آج بھی ذہن کو فارغ البالی تو مہیا نہیں ہے تاہم مزید تاخیر کے تدارک کی خاطر چند کلمات عرض خدمت کرنے لگا ہوں۔

ڈاکٹر غلام علی چودھری انگریزی ادبیات کے نامور اور مقبول اُستاد ہیں۔ جامعہ پنجاب میں کئی سال تک شعبۂ ادبیات انگریزی کے سربراہ رہے اور سینکڑوں طلبہ کو علمی فیض پہنچایا، فقط علمی فیض ہی نہیں پہنچایا بلکہ ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی فرمائی اس لیے کہ تعلیم بے تربیت ایک خطرناک اکتساب ہے۔ جو وحشیوں کی ذہانت میں اضافہ کر کے ان کو مزید وحشی بنا دیتا ہے نہ کہ پہلے سے بہتر انسان۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعۂ پنجاب کے علاوہ جن جن علمی اداروں میں مُعلّمی کا فریضہ ادا کیا ان میں اسلامیہ کالج لاہور اور دیال سنگھ کالج لاہور شامل ہیں ـــــ اس کے علاوہ انہوں نے ژیل یونیورسٹی امریکہ میں نل برائٹ فیلوشپ ایڈنبرا یونیورسٹی میں سینیئر فیلوشپ ایڈنبرا یونیورسٹی میں کامن ویلتھ سٹاف فیلوشپ ایڈنبرا یونیورسٹی میں برٹش کونسل فیلوشپ کے دوران انگریزی ادبیات کے سلسلے میں تحقیقی کام کیا، ڈکنز، کارلائل اور عہد الزبتھ کا ڈرامہ ان کے خصوصی موضوعات تھے۔

ڈاکٹر غلام علی چودھری بھی ان روشن دماغ اور روشن دل اہلِ علم و فکر میں سے ہیں جن کو جلوۂ دانش فرنگ خیرہ نہ کر سکا بلکہ جن کو اُلٹا استحکامِ ایمان نصیب ہوا ـــــ وہ مغربی معاشرے میں رہ کر پہلے سے بھی زیادہ بالیقین مردِ مومن بن گئے، اور قومی و ملّی معاملات میں ان کی دلچسپی میں بیشتر اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اُمّتِ مسلمہ کے نفع و ضرر کو پہلے سے بھی زیادہ حدت کے ساتھ محسوس کرنے لگ گئے اور اضطراب بڑھتا چلا گیا۔

شاید حضرت جامیؒ کا مصرعہ ہے۔ "ہر زماں دیوانہ می گردد خردمندے دگر" ـــــ یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ وہ اصحاب بھی کسی خاص ذہنی کیفیت میں یکسر محتاط ہو جاتے ہیں جن کی عمومی روش خاصی معتدل تصوّر کی جاتی ہے۔ یہاں بدقسمتی سے سردار عبدالقیوم صاحب کے بعض ارشادات ہدفِ توجہ بنے ہیں اور ڈاکٹر غلام علی چودھری صاحب نے اس ضمن میں اپنے ملاحظات اور تصریحات کو قلمبند کر دیا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے دل کی تپش اور جگر کے گداز کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس باب میں اکیلے نہیں ـــــ ہزارہا افراد کے یہی احساسات ہیں مگر ظاہر ہے کہ سب لکھنے پر اور وہ بھی اس محققانہ سلیقے کے ساتھ لکھنے پر قادر نہیں ـــــ کوئی شخص فخر بھی کرے کہ وہ خادمِ اسلام ہے اور پھر خدمتِ اسلام ہی کی نسبت سے جو لوگ اکابرِ اُمّت میں شمار ہوں ان کی توہین بھی کرے۔۔۔ امر ہر فرد مخلص کے لیے پریشان کن بلکہ تکلیف دہ ہے، کوئی فرد کسی سُنّت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین ہو اور اس پر مغرور ہو کہ دُوسروں کو کمتر درجے کا مسلمان گردانے لگے تو یہ کتنی اذیت رساں بات ہے ـــ جس کو جس قدر راہِ سُنّت پر چلنے کی توفیق ارزانی ہو اسے اتنا ہی منکسر مزاج ہونا چاہیے نہ یہ کہ وہ دوسروں کے لیے خدائی فوجدار بن جائے۔ حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت "عبد" بلند ترین اور عظیم ترین خطاب "الامین" ہے، پھر اس سب سے بڑی محمدیؐ علامت کو ہم بظاہر بڑے متدین اور پاسدارانِ سُنّتِ نبویؐ کہاں تک اپناتے ہیں؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُوسری نمایاں ترین سُنّت فقر ہے، آپؐ نے فرمایا۔ "الفقر فخری" مگر درویشی کو عملاً افتخار جاننے والے ہم میں کتنے ہیں؟ ہم نے بڑے بڑے دین پرستوں کو دیکھا ہے کہ ان کی وجاہت اور شان و شوکت کی نمائش میں ناخن بھر کسر رہ جائے تو بھڑک اُٹھتے ہیں، لیکن اگر ان کو بظاہر کسی سُنّت کی پاسداری کا شرف حاصل ہے تو وہ اس خاص معنیٰ میں دوسروں کو نخوت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اے کاش کوئی اتنا خیال ہر دم رکھے "تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی"؟ ـــــ رہی حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری کا مسئلہ اور اس کی رُوح تو پھر اسے "کاش" ہی کہا جا سکتا ہے۔

آدمی آدمی رہتا ہے، کوئی ہیرا کوئی کنکر، آدمی اپنی اہلیتوں اور خُدا کی عطا کردہ نعمتوں کا صحیح مصرف جانے اور پھر ان کو صحیح طور پر کام میں لائے، وہ تو یقیناً بھلا آدمی ہے، وہ خیر کا مظہر ہے وہ اگر اپنی اہلیتوں کو اور انعاماتِ خداوندی کو غلط طریق پر استعمال کرے تو وہ شر کا مظہر ہے۔ —— جس طرح ذہانت کا غلط مصرف ظلم ہے اسی طرح دولت کا غلط مصرف ظلم ہے، اثر و رسوخ کا غلط مصرف ظلم ہے، فصاحت و بلاغت کا غلط مصرف ظلم ہے، قوت و اقتدار کا غلط مصرف ظلم ہے، اور ظلم سراسر شر ہے —— اس کے برعکس اگر یہی سارے عناصر صحیح طور پر اور بجا عمل میں آئیں تو یہ سراسر انعاماتِ الٰہی ہیں، لہٰذا خیر ہیں۔

جوہرِ شاعری بھی ایک عطیۂ خداوندی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی اہلیت اور قوت ہے اس کا بھی غلط استعمال غلط ہے اور صحیح استعمال صحیح ہے۔ اس لیے اپنی باتخلص برادری سے التماس ہے کہ وہ قرآن حکیم کو اپنا دشمن صحیفہ نہ جانیں، قرآن نے اس نعمت کا غلط استعمال کرنے والوں پر تبصرہ کیا ہے، اور فقط تبصرہ کیا ہے —— ذیل میں سورۃ الشعراء کی متعلقہ تین آیات کا ترجمہ درج کیا جا رہا ہے اور یہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی تفسیرِ ماجدی سے لیا گیا ہے:

"اور رہے شاعر تو ان کی پیروی بدراہ لوگ کرتے ہیں، کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ (شاعر) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو وہ کرتے نہیں: البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا، اس کا بدلہ لیا (تو وہ اس حکم میں داخل نہیں)"۔

مولانا مودودیؒ نے "بدراہ لوگ" کی جگہ "بہکے ہوئے لوگ" تحریر کیا ہے۔ گویا قرآن نے شاعروں کے دو گروہ قرار دیئے ہیں۔ وہ شاعر جو ہر وادیٔ خیال میں سرگرداں ہیں، اور چونکہ خیال پرست ہیں لہٰذا وہ کچھ کہتے چلے جاتے ہیں جو آوارہ خیالی انہیں عطا فرماتی ہے، یوں کہہ لیجئے کہ یہ "قافیہ شکار" لوگ ہیں اور پھر "شکارِ قافیہ" بھی —— شعراء کا دُوسرا وہ گروپ ہے جو ایمان والے لوگ ہیں، خوش کردار ہیں، خدا سے غافل نہیں ہوتے، اور یہ وہ لوگ ہیں کہ ان پر

زیادتی اور ظلم ہو تو وہ بدلہ لینے اور فتح یاب ہونے کی نیت سے کبھی شاعری کو ہتھیار بنا لیتے ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ یہاں ظلم سے مُراد صرف شاعر کی ذات کے خلاف عمل میں آنے والا ظلم نہیں، بلکہ وہ شعراء جو اصُولاً ظلم کے دشمن تھے، اگر ان کے قبیلے پر ظلم ٹوٹا تو وہ نعرۂ قصاص بن گئے۔ یہاں اشارہ شعرائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف بھی ہے جنہوں نے قریش کے ظلم کا جواب دیا۔ قریش کے ظلم سے قریش کے شعرا کی زبان درازی بھی مقصود ہے یو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم۔ اسلام اور صحابہ کرامؓ کے خلاف کارفرما تھی۔ چنانچہ حضرت نبئ اعظم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت حسّانؓ اور ان کے دو ایک شاعر رفقاء سے فرمایا کہ وہ قریش کی اپنے شعروں میں اچھی طرح خبر لیں، حتیٰ کہ نبئ اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ بھی دُعا فرمائی کہ اے مولا! حسّان کو جبریلِ امین کے ذریعے مدد عطا فرما۔ واضح ہوا کہ اُمّتِ مسلمہ کی ہمّت بندھانا، دفاعِ دین کرنا اور وہ اشعار کہنا جو مثبت ہوں، جن سے غیرت اور حمیّت جاگے، جن کے باعث قصاص کا جذبہ زور پکڑے، جن کی بدولت غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں، جن کے باعث ظلم و زیادتی کا قلع قمع کرنے میں مدد ملے، جن کی بدولت انسان کو مقامِ انسانیت یاد رہے وغیرہ، شعرائے اُمّت کا فریضہ ہونا چاہیئے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ عہدِ جاہلیّت کی سوسائٹی بے مقصد اور آوارہ سوسائٹی تھی، اس سوسائٹی کا نظام قبائلی تھا۔ قبائلی عصبیّت پر ان کی جمعیت کا انحصار تھا، چنانچہ ہر وہ شے جو اپنے قبیلے سے متعلق تھی، وہ دُرست تھی۔ دُوسرے قبیلوں کی ہر شے غلط تھی۔ اپنے قبیلے کی بُرائی بھی اچھائی تھی، دُوسرے کی اچھائی بھی بُرائی تھی ـــــ قدرتی بات تھی کہ اس طرح جھوٹ اور افترا کو زبانِ مبالغہ میسّر آگئی۔ شاعر کو ترجمانِ قبیلہ ہونے کی حیثیت سے مقامِ تفاخر حاصل تھا، اور وہ اپنے تفاخر کے بیان میں بھی غلو سے کام لیتا تھا۔ معیارِ اخلاق کوئی تھا نہیں۔ خوبصورت الفاظ ہیں اور خوش آہنگ اوزان میں غلط سے غلط بات دلوں میں اُترتی چلی جاتی تھی ـــــ چنانچہ وہ عوام الناس جن کے سامنے کوئی واضح لائحۂ حیات نہ تھا، کوئی

ضابطۂ اخلاق نہ تھا اور جو سرے سے معنی انسانیت ہی سے آشنا نہ تھے، ان شعراء کی کورانہ تقلید کیے چلے جاتے تھے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ قرآن کی ان آیات کا واضح اشارہ انہی بے لگام شعراء کی طرف تھا۔

لیکن لائق ملاحظہ توجہ بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے شعراء کو تو فقط ہر وادیٔ خیال کا حیران زائر و سیار قرار دیا مگر ان کے پیچھے چل پڑنے والوں کو بہکے ہوئے، آوارہ اور اہل غوایت بتایا ہے۔ شاعروں کو محض شاعر ہونے کے باعث گنہگار قرار نہیں دیا۔ کوئی شاعر کیا کہہ رہا ہے، اس پر ہوشمندی سے نگاہ ڈالنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کا کلام قبول کرتے ہیں — بازار میں ہر شے موجود ہے، خریدار کا فرض ہے کہ دیکھے اسے کیا چاہیئے، اچھی چیز درکار ہے یا بُری۔ ہمارے مرحوم دوست اور کرم فرما پروفیسر کرامت حسین جعفری فرمایا کرتے تھے کہ جب کھڑکی سے گندی ہوا، دھواں یا غبار یا ناقابلِ برداشت سردی یا گرمی داخل ہو تو کھڑکی بند کر دی جاتی ہے، لہٰذا غلط، نقصان دہ اور پریشان کن افکار کے مقابل اپنے ذہن کی کھڑکی بند کر دینی چاہیئے۔

شعر میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بہت بڑی قوت ہے۔ اس قوت کا استعمال غلط بھی عمل میں آسکتا ہے اور صحیح بھی۔ مگر آوارہ مزاج اور اہلِ غوایت فقط عیاشی کے مضامین اور لذتیت کے معانی طلب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکثریتِ کثیرہ غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارتی ہے اس لیے انہی نابالغ عیاشانہ مضامین پر فدا ہوتی ہے۔ تازہ اور مفید غذا کو چھوڑ کر اگر کوئی خوشنما لذت بخش مگر ضرر رساں غذا قبول کرتا ہے بلکہ بخوشی خریدتا ہے تو ذمہ داری اس کی اپنی ہے۔ گویا ایک شاعری تو مثبت ہے اور ایک منفی، ایک آدم گر، اور ایک آدم کُش۔ ایک غیرت آموز ہے، ایک حمیت سوز۔ ایک زندگی میں حُسن پیدا کرتی ہے اور ایک زندگی کو فرسودہ اور بھیانک دکھاتی ہے۔ ایک نغمۂ بہار و نصرت ہے اور ایک صدائے خزاں اور نوائے ہزیمت — لہٰذا شعراء خود دیکھ لیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ واضح ہو جائے گا کہ وہ کس صف میں کھڑے ہیں — رہے قارئین شاعری اور فدایانِ شعراء تو یہ ان کا اپنا فرض ہے کہ آنکھیں کھلی رکھیں اور دماغ کو بیدار

تاکہ رُوح کو غلط غذا سے بیمار نہ کریں اور زندگی کی معنویت کو لایعنیت میں نہ ڈھال دیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی سورۂ الشعراء کی آخری آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ہر وادیٔ خیال میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے شعراء کے مقابل دوسری جماعتِ شعراء کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"لیکن اس عام بے راہ روی کی شاعری کے حکم سے وہ شاعری یقیناً مستثنیٰ ہے جو حقائق اور صداقتوں کی جامع ہے، جو نصرت و حمایتِ حق میں کی جائے، جس سے کام دین کے غلبے کا لیا جائے۔ اسلامی نظمیں، جوشِ دینی پیدا کرنے والی، عصبیتِ اسلامی کو بیدار کرنے والی، سب ذکرِ الٰہی کی فرد ہیں۔ شاعرِ دربارِ نبوت حضرت حسّان رضی اللہ عنہ ثابت سے لے کر مولانا رُومؒ اور پھر اقبالؒ و جوہر و اکبرؒ کی شاعری اسی طبقے کی ہے۔"

دین پرور، غیرت آموز، حق جُو اور نصرت آرزو شاعری کو مولانا عبدالماجد دریابادی ذکرِ الٰہی کی فرد قرار دیتے ہیں۔ جو شاعر آدم گری، اُمّت سازی اور تقویتِ دین کے لیے زندگی بھر مضطرب رہے ہوں۔ کیا ان کا یہ عمل ذکرِ الٰہی ہے یا نہیں؟ — مولانا ماجد کے نزدیک یہ ذکرِ الٰہی کی ہی ایک صورت ہے، یہ تعلیم گمراہی کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟ جی تو نہیں چاہتا کہ یہاں ضمناً سردار محمد عبدالقیوم خان کا ذکر کیا جائے جو بفضلِ خُدا اپنے علم و دانش کے کمال کی بدولت اور وجدان و بصیرت کی عرش نشینی کے باعث کلامِ اقبال کے مطالعے سے عزیزوں اور بزرگوں کو منع فرماتے ہیں۔ وہ ایک تازہ تحریر میں سورۂ والشعراء کا ترجمہ تحریر فرما کر آگے ارشاد کرتے ہیں۔ "ان آیات میں شعرا کی اتباع کو دوسرے سے منع کر دیا گیا، اگرچہ ان کا بچاؤ اس طرح کیا گیا کہ ہاں اگر وہ ایمان والے ہوں اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہوں۔ اس میں بھی اتباع کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس کو دوسرے سے منع کر دیا گیا، اتباع تو صرف خُدا کے رسولؐ اور صحابہؓ کی کی جائے گی" ——

اِن بزرگوار نے کیا خوب گڑبڑ جھالا ڈالا ہے۔ عیاں ہے کہ اتباع کا معنیٰ پیروی ہے۔

اس کا صرف ایک ہی درجہ اور قسم نہیں، سینکڑوں درجات اور قسمیں ہیں۔ ایک عام درجہ ہے مثلاً چھوٹے بڑوں کی پیروی کرتے ہیں، شاگرد استاد کی پیروی کرتے ہیں، مرید اپنے مرشد کی پیروی کرتے ہیں، ہاں، وُہ پیروی جس کی طرف مشارٌ الیہ اشارہ کر رہے ہیں، اس پیروی سے مقصود اطاعت ہے۔ وہ اللہ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز اہلِ اسلام کے اولوالامر کے لیے ہے۔ اگر بیٹا اپنے باپ کی پیروی میں سخاوت کو شعار بنائے، شاگرد اپنے اُستاد کی پیروی میں ایک خاص علم میں مہارت پیدا کرنا چاہے، کوئی مُرید اپنے مرشد کے حسبِ ارشاد کوئی ریاضت کرے تو کیا اس امر کو اتّباع نہیں کہا جائے گا؟ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتّباع کے باب میں بے حساب درجات کا مفہوم ذہن میں نہیں اور حضرت فتویٰ دینے چل کھڑے ہوئے۔ میں کسی شاعر کے اتباع میں غزل کہوں تو اس کا معنیٰ کیا ہو گا؟ ہمیں تو بتایا گیا ہے کہ دانش و حکمت کی بات جہاں سے ملے، لے لو۔ اچھی بات خواہ دیوار پر لکھی ہو، وہ بھی حاصل کر لو۔ اور ظاہر ہے کہ اچھی بات فقط رٹنے کی نہیں ہوتی، اس پر عمل بھی کیا جانا چاہیئے تو پھر کیا یہ آزاد کشمیر کے سردار صاحب کہیں گے کہ دیوار کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ یہ محض کلمۂ اتباع کو مرادی معنی کی زنجیر میں کس کر علامہ اقبال کے کلام سے خیر جوٗ اور ملّت دوست لوگوں کو دُور رکھنے کی کوشش ہے اور یہ انہوں نے بخیالِ خویش، اس دَور کی بے بہا دینی خدمت فرمائی ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اِن بزرگوارِ ولایت آثار کو چاہیئے کہ خود بھی علامہ کے اس قول کی پیروی سے بچیں اور عزیزوں کو بھی اس قول کی پیروی سے بچائیں۔

علامہ فرماتے ہیں:

گر تو میخواہی مُسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

انہیں چاہیے کہ خود بھی علامہ کے اس ارشاد کی پیروی سے بچیں اور عزیزوں کو بھی اس ہدایت کے قبول کرنے سے بچائیں ورنہ یہ علامہ اقبال کا اتباع قرار پائے گا۔ حضرت علامہ نے فرمایا ہے :

گوہرِ دریائے قرآن سفتہ ام
شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

میں نے دریائے قرآن کے موتی پروئے ہیں شرح رمز صبغۃ اللہ بیان کی ہے (خدا کے رنگ میں رنگے جانے کی بات سمجھائی ہے) تو بھی موتی کی طرح اس لڑی میں اپنے آپ کو پرو لے ورنہ تو خاک کے ذرّوں کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔

انھیں اس قول کی پیروی سے خود بھی محفوظ رہنا چاہیئے اور عزیزوں کو بھی محفوظ اس کے اتباع سے باز رکھنا چاہیئے ——— حضرت علامہ اقبال کا انگلستان سے واپسی کے بعد کا اکثر کلام اور حادی مجموعۂ اشعار تقویتِ دین کے مختلف مضامین پر مبنی ہے اور یہ مسلسل تیس سال کا عرصہ ہے۔ اس عرصے کے کلام کی روح انہیں اُس صف میں شامل کرتی ہے جس صف کا آغاز حضرت حسّان رضؓ بن ثابت سے ہوا تھا جیسا کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے حوالے سے ابھی اُوپر عرض ہو چکا ہے۔ ہم ان بزرگوار کی خدمت میں عرض کریں گے کہ قرآنِ کریم نے بھی شاعر اور شاعر میں فرق روا رکھا ہے، اور وہ بڑا واضح فرق ہے۔ حضرت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وحیِ خداوندی نازل ہو رہی تھی۔ لہٰذا مشیتِ ایزدی یہی تھی کہ نہ آپؐ خود شعر کہتے اور نہ آپ کے حافظے میں شعر محفوظ رہتے، اور حسبِ بیان قرآن آپؐ کو شاعر ہونا بھی نہیں چاہیئے تھا (سورہ یٰسین) عام عرب تو قرآن کو بھی شاعری قرار دے رہے تھے کیونکہ یہ باتیں جو قرآن میں بیان ہو رہی تھیں، عام عرب افراد تو رہے ایک طرف خود عرب شعرا کے ذہن و شعور کی سطح سے بھی بلند تھیں۔ ان کے شعور کو عاجز کر رہی تھیں لہٰذا وہ کہتے تھے محمد مصطفےٰ کوئی عجیب و غریب شاعری کر رہے

ہیں۔ اسی لیے سورۂ والشعراء میں واضح کیا گیا کہ عام شاعر تو اِدھر اُدھر ہر وادیٔ خیال میں بھٹکتے ہیں۔ اس کے مقابل قرآن میں کوئی تضادِ معنوی نہیں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق بھلا ان جاہلی شعرا کے پیچھے لگ چلنے والے کون لوگ تھے؟ وہ تو آوارہ خیال، ژولیدہ فکر، اربابِ غوایت تھے۔ اس کے مقابل جن لوگوں نے حضور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم گردنِ اتباع و اطاعت خم کی ہے وہ ایمان و صداقت کے مالک لوگ تھے، وہ پاکباز اور متقی لوگ تھے ــــ اس طرح قرآن نے یہ فرق بھی بیان کر دیا کہ بت پرست، قبیلہ پرست، ہوس پرست، تکبر آموز اور تعصب افروز شعر کے پیچھے اندھا دھند چل پڑنے والے لوگ تو وہی ہیں جو بھٹکے ہوئے ہیں اور کھوکھلی کھوپڑی کے مالک ہیں، وہ اہلِ غوایت ہیں اور اس لیے ہیں کہ وہ سوچتے نہیں کہ انہیں شعر کے خوبصورت سلانچے میں ڈھال کر شہد دیا جا رہا ہے یا شراب، یا زہر۔

یہ ہے شاعر اور شاعر میں فرق ــــ شاعر خود اپنا جائزہ لے لیں۔ قرآن نے جملہ شعراء پر نہیں بلکہ آوارہ خیال اور بے مُراد شعراء پر تبصرہ کیا ہے۔ فقط ان کا وصف بیان کیا ہے۔ محض شاعر ہونے کے باعث انہیں گنہگار قرار نہیں دیا۔ لہٰذا شاعر اپنے آپ کو از روئے شرع مجرم نہ جانیں ــــ اور بزرگوار سردار آزاد کشمیر کی پرواہ نہ کریں جنہوں نے حضرت علامہ اقبال کے باب میں ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کر لیا ہے اور حضرت علامہ اقبال کی شاعری کو ایک ناگوار شے ثابت کرنے کے لیے قرآن کا سہارا لے رہے ہیں، اور اس طرح شاعری کے جوہر ہی کا سرے سے قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں ــــ وہ کھلے دل سے قرآنی فیصلے کو پیشِ نظر رکھنے پر آمادہ نہیں کہ ہر بُری شے کی طرح قرآن صرف بُری شاعری سے آدم کو آگاہ رہنے کی اور اس کے غلط اثر سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ شاعری از روئے جوہر خود رحمانی عطیہ ہے۔

شاید ان سردار صاحب کو معلوم ہو کہ حضرت علی مرتضےٰ رضؓ اور حضرت بلال رضؓ سمیت بہت سے اصحابِ رسولؐ شعر کہتے تھے۔ ائمہ سادات خود بھی شاعر تھے اور شعر کا منجھا ہوا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے تھے۔ ہمارے اکابر فقہاء میں سے کثیر التعداد حضرات شاعر تھے۔ حضرت امام

شافعیؒ کے تو مجموعۂ کلام کا ذکر بھی نظر سے گزرا ہے۔ حضرت امام بوصیریؒ، عطارؒ، ابن الفارضؒ، حکیم سنائیؒ اور حضرت داتا گنج بخشؒ اور امام قشیریؒ اور ان کے علاوہ درجنوں بلکہ سینکڑوں اولیاء اللہ شاعر تھے، اور وہ ایسے اولیاء اللہ تھے جو علومِ دین میں اپنے اپنے دَور کے سربراہوں میں شمار ہوتے تھے ـــــ یہ ہمارے بدقسمت سردار مذکور جو پیکرِ علم و وجدان بزرگ ہیں، اُن اکابر کی خاکِ پاک کے ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں ٹھہرتے ـــــ

وہ بُزرگ فرماتے ہیں کہ علّامہ اقبال کے بارے میں ان کی بظاہر گستاخانہ بات نے ہلچل مچا دی ہے۔ ان کے خیال میں انھیں حضرت علامہ کی توہین کرنے کا حق اس لیے حاصل ہے کہ علامہ معصوم عن الخطا نہ تھے وہ ولی نہ تھے، پیغمبر نہ تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ حضرت علامہ اقبال کا کوئی نیازمند انہیں معصوم عن الخطا نہیں جانتا، کوئی انہیں پیغمبر نہیں مانتا۔ لیکن گفتگو کی یہ ایک عجیب روش ہے اور نہایت گستاخانہ اور بے ادبانہ روش ہے۔ ایک بُزرگِ قوم کی توہین کرنا، ایک محسنِ ملّت اور عاشقِ رسُولِ خُدا کو سرِعام دشنام کا ہدف بنانا اور جواب میں یہ کہنا کہ وہ کوئی معصوم عن الخطا فرد نہ تھے ـــــ وہ کوئی پیغمبر کا درجہ رکھنے والے شخص نہ تھے، اس لیے ان کی توہین جائز ہے ـــــ ہم جواباً ایسے جملہ دریدہ دہن افراد سے یہ پُوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے آباجانوں اور دادا جانوں کو خیال میں لائیں، اور بمقابل علامہ اقبال ان سب کی خدمتِ اسلام کا درجہ بھی ملاحظہ فرمائیں اور پھر کسی شخص سے سُنیں کہ اُن کے ابّا جان بدعمل تھے تو ان کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ کوئی ان مکرّم معترض سے کہے کہ اگر کوئی شخص ان کے والدِ بزرگوار کو بدعمل کہے تو ان کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ ـــــ وہ یقیناً بندوق اُٹھائیں گے کہ ان کے والد کو گالی دی گئی ہے اور پھر جب وہ بندوق اُٹھائیں تو اُن سے کہا جائے کہ آپ کے والدِ بزرگوار کوئی ولی یا پیغمبر تو نہ تھے ـــــ وہ معصوم عن الخطا تو نہ تھے اس لیے میں تو گالی دُوں گا ـــــ کیا یہ جواب سُن کر وہ اپنے والد بزرگوار کا لقب "بدعمل" کے طور پر قبول کرلیں گے؟ اِن متقی بزرگوار کو میری یہ وضاحت بھی ناگوار گزرے گی، لیکن اِن حامیِ اسلام کو ذرا یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ایک ایسے فردِ فرید کی توہین کر رہے ہیں جو کروڑوں

مسلمانوں کا روحانی باپ ہے؟ ـــــ مزید مضحکہ ملاحظہ ہو کہ وہ حضرت کہتے ہیں کہ وہ علماء سے فتویٰ طلب فرمائیں گے کہ آیا انھوں نے کوئی شرعی گناہ کیا ہے۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ حضرت آپ نے ایک بزرگِ ملت کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ نے کروڑوں دلوں کو دُکھی کیا ہے۔ یہ مسئلہ فقہی مسئلہ بھی ہے۔ مگر اس سے زیادہ اخلاقی ہے اس لیے آپ علما کو تکلیف نہ دیں، آپ اہلِ دل سے مشورہ طلب کریں!

سردار عبدالقیوم صاحب نے ناروے کی ایک مسجد میں خطبہ عطا فرمایا اور اس دوران میں حضرت علامہ اقبال کی یہ رُباعی بطور گواہ سُلطانی پیش کی اور معنیٰ اپنی مُراد کے مطابق لیا۔ حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ بعض معانی بنیادی ہوتے ہیں، بعض انتقادی، بعض فسادی اور بعض مرادی، مرادی سے مراد وہ معانی ہیں جو میں لینا چاہوں اس قول کے کہنے والے کا وہ معنیٰ ہو یا نہ ہو، وہ رباعی علامہ کی بڑی مشہور رُباعی ہے۔ ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر ...

به پایاں چوں رسد ایں عالم پیر   شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را   حسابِ من ز چشمِ اُو نہاں گیر

اِس رُباعی کا پس منظر یہ آیۂ کریمہ ہے، اور یاد رہے کہ حضرتِ علامہ کے سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جو کسی آیت یا حدیث کے مفاہیم پر استوار ہیں یا اس سے پرتو پذیر ہیں۔

" فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ (سورۂ نساء ۴۱)

" اِس وقت کیا حال ہو گا۔ جب ہم ہر اُمّت سے ایک گواہ شاہد (اس اُمّت کا نبی اور رسُول) لائیں گے اور اِن (افرادِ اُمّتِ محمّدیہ) پر آپؐ کو بطور گواہ و شاہد لے آئیں گے"؟

مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے تفہیم القرآن (جلد اوّل، ص ۳۵۳) میں لکھتے ہیں :۔

"یعنی ہر دَور کا پیغمبرؑ اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ

زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی۔ میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا، پھر یہی شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دَور کے لوگوں پر دیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دَور آپؐ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک رہے گا"۔

اور پُرسشِ اعمال کی گھڑی وہ گھڑی ہے کہ بقول مولانا حالیؒ

جہاندار مغلوب و مقہور ہیں واں
نبی اور صدیق مجبور ہیں واں

اگر تصور میں وہ منظر آئے کہ افرادِ اُمّت کے نامہ ہائے اعمال کھولے جا رہے ہیں اور رسُول اللہؐ دیکھ رہے ہیں تو اصحابِ ایمان پر کیا گزرنی چاہیئے، سر سے بدن تک لرزہ مسلط ہوگا اور کپکپی طاری ہوگی، ہر لب پہ ہوگا میرے مولا! تو ستّار ہے، تو غفّار ہے مگر نبی حبیبؐ کے حضور میں اس بندۂ گنہگار کی رسوائی، مولا اس شرمندگی سے بچا، یہ کیفیت الفاظ کی گرفت سے وراء الوراء ہے — اسی منظر کی لرزہ خیزی اور رسوا سازی کے تصور میں علامہ اقبالؒ چیخ اُٹھے۔

گر حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

اِس دلگداز سپردگی اور عجز بندگی اور شعورِ شرمندگی کو سردار صاحب نے بڑی بیدردی سے یُوں بیان کیا کہ دیکھا اقبال اپنی بدعملی کا اقرار کر رہا ہے — حد ہے، اس منظر کا تصور سردار صاحب کو رُلاتا نہیں اُلٹا ان کو اپنی پاکبازی اور تقدس کا شعورِ کبریائی عطا کرتا ہے — اِس عالم میں کہ محشرستانِ خود احتسابی ہوگا۔ سردار صاحب فرمائیں گے وہ دیکھا وہ سائے لرزنے کانپنے والے بدعمل ہیں — جس کا معنیٰ ہُوا کہ بحمداللہ مَیں سرتاسر پاک ہوں، مجھے عرش پہ پاکیزہ سرشت حُوروں نے صابُونِ الفردوس سے نہلا کر بالکل اُجلا، تروتازہ،

بے داغ آثار دیا ہے ـــــ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سردار صاحب اس لرزہ ناک منظر کے پیدا کردہ اقبالی شعور و احساس درماندگی کو اس طرح ایک بے درد محتسب کی طرح نہ دیکھتے ـــــ آخر میں بس اتنی سی گزارش ہے کہ اپنی حدود سے تجاوز ظلم ہے ـــــ حدود کی بھی بے شمار قسمیں ہیں اور ظلم کی بھی، بقول علامہ اقبال

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

وہ جس کے پاس بضاعتِ معذرت کے سوا کچھ نہیں

پروفیسر محمد منوّر

اکتوبر ۱۹۸۸ء

عوض معاوضہ

حیات و خدمات اقبال کی عظمت کوئی واہمہ نہیں، ایک حقیقت ہے جس کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے اور فکر و شعرِ اقبال کا اعجاز کوئی حادثہ نہیں، ایک عمل ہے جو گزشتہ ستر پچھتر برس سے برصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر ہمارے علم و ادب اور دین و سیاست کی وسعتوں اور گہرائیوں میں برابر جاری و ساری ہے۔ یہ عمل مسلم ایشیا اور افریقہ کی عصری تاریخ کی ان قوتوں میں، جو اسلامی نظریے کی ترویج اور اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں شریک ہیں، یقیناً سب سے زیادہ فعال اور مؤثر قوت ہے کیونکہ اس کی ہمہ گیری نسلی، لسانی اور علاقائی قیود سے یکسر آزاد ہے۔

حیات و خدماتِ اقبال کی عظمت اور فکر و شعرِ اقبال کے اعجاز کا اعتراف کرتے ہوئے قائداعظم نے ان کی رحلت پر فرمایا:

"میرے لیے وہ ایک رہنما بھی تھے اور دوست اور مفکر بھی۔ تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہ ہوئے۔"

پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد قائداعظم نے فرمایا:

"آج اقبال زندہ ہوتے تو خوش ہوتے، ہم نے ٹھیک وہی کیا ہے جو وہ چاہتے تھے کہ ہم کریں۔"

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک یعنی پاکستان کے پہلے چالیس سالوں میں اگرچہ حکومتوں اور حاکموں کو ملک و ملت کی تعمیر میں قائداعظم اور اقبال کے افکار و عزائم سے کوئی خاص سروکار نہ تھا تاہم انہوں نے ان دو عظیم محسنوں کی تکریم کی طرح ڈالی اور پھر سرکاری اور غیر سرکاری رسمی تقریروں میں مقرروں، شاعروں، مورخوں، ادیبوں، مصوروں، مغنیوں اور ذرائع ابلاغ عامہ کے کارپردازوں کی محبت بھری کاوشوں سے قائداعظم اور علامہ اقبال کے نام اور چہرے ہمارے قومی شعور کے افق پر دو روشن ستارے بن کر نقش ہو گئے۔

افسوس صد ہزار افسوس کہ پاکستان کے استقلال کی چالیسویں سالگرہ پر حکومتِ آزاد و جموں کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے ناروے میں ڈاکٹر جاوید اقبال سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کی ذات اور کلام کے خلاف طعن و تشنیع کی زبان دراز کی اور پھر لاہور اور راولپنڈی میں ان الزام تراشیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگر کوئی مسندِ حکومت پر متمکن شخص یہ سمجھ لے کہ اس کے منصب جلیلہ کی مراعات میں یہ رعایت بھی شامل ہے کہ وہ دیس پردیس ملک و ملت کے محبوب رہنماؤں کی توہین کرتا پھرے تو پھر کسی بھی شہری کو اس کے مواخذے کا حق پہنچتا ہے۔

اقتداریوں کھلم کھلا عدل کی حدود سے تجاوز کرے گا تو حرفِ حق بر سرِ عام اس کا گریباں گیر ہوگا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد

یہ حاکم و محکوم کا باہمی اسلامی حق ہے کہ ایک دوسرے کو ظلم سے روکیں مگر جب تک قاعدے اور قانون سے قول و فعل کی حدود متعین نہ ہوں عدل اور ظلم کا تصور تک ممکن نہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں ہر جگہ عدل کا فقدان ہے اور ظلم کا دور دورہ ہے کیوں کہ حاکم اور محکوم دونوں ہی اپنے اپنے دائرہ کار میں آئین، قانون اور ضابطے سے باغی ہیں۔

۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس لاہور میں موچی دروازے سے باہر برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا۔ اسلامیہ کالج لاہور کے طلباء رضا کارانہ انتظامی خدمات انجام دے رہے تھے۔ کونسل کے ارکان آ رہے تھے اور اپنی رکنیت کے کارڈ دکھا دکھا کے اندر جا رہے تھے۔ اچانک ہال کے باہر لگی ہوئی بھیڑ نے "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے بلند کیے۔ قائداعظم تشریف لائے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے ہال کے دروازے کی طرف بڑھے۔ داخلہ چیک کرنے والے رضا کار کو جانے کیا سوجھی، اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"کارڈ جناب!"

اور پھر اس کی اور لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ اگلے ہی لمحے قائداعظم جیب سے کارڈ نکال کر اسے دکھا رہے تھے۔ انہوں نے متبسم ہو کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور اندر تشریف لے گئے اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے بلند سے بلند تر ہو گئے!

برکت علی محمڈن ہال کے باہر اس بھیڑ میں مَیں بھی تھا۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ یہ چھوٹا سا واقعہ قائداعظم کی عظمت کا کتنا بڑا مظہر ہے! وہ وقت کتنا عظیم تھا جب کارواں اور سالارِ کارواں کے درمیان اعتماد، احترام اور محبت کی بنیاد آئین، قانون اور ضابطے کی پاسداری پر تھی! آج تو سب سے بڑا وہ ہے جو سب سے بڑی بےقاعدگی کر سکے! ایسے میں دھن، دھونس اور دھاندلی کی دھما چوکڑی نہ مچے تو اور کیا ہو؟

آئین، قانون اور ضابطے کی بالادستی سے زندگی میں حق اور ناحق کی تمیز قائم ہوتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ جسے اللہ حق اور ناحق کی تمیز عطا کرتا ہے۔ وہی آئین اور قانون اور ضابطے کی بالادستی کا نقیب ہوتا ہے۔ حق کو سچ کا معنی دیجیے یا جائز تصرف کا بات وہی ہے یعنی ایک حدِ فاصل جو انسانی شعور معروف اور منکر کے درمیان کھینچتا ہے۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کا پیشہ وکالت تھا جس میں کم از کم نظریتاً انسان کی ساری کاوش حق اور ناحق کے تعین کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں زعماء کے فکر و عمل میں سب سے بڑی قدر مشترک حق اور عدل سے تقوے کی حد تک پہنچا ہوا رشتۂ وفا ہے۔ ان دونوں کی زندگیاں اور کارنامے کیا جزئیات میں اور کیا بطور کل (مثلاً چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے واقعات سے لے کر برصغیر میں مسلم اکثریتی علاقوں کے حقِ خودارادیت کی منزل تک) کسی مرحلے پر بھی التباسِ حق اور کتمانِ حق کے متحمل نہ ہو سکے۔ حضرت علامہ بار بار فرماتے ہیں ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند!

○

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

○

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا نہیں ہے

○

جس بندۂ حق بین کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و برّاق

○

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

○

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

○

جو بات حق ہو، وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر

○

اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے
میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

○

اقبال کی حق اندیشی، حق آگاہی اور حق گوئی کے خلاف باطل کی قوتوں نے بغض و عداوت کا جو بودا حصار کھڑا کرنے کی کوشش کی اس کے پشتے متعصب ہندو مہا سبھائیوں سے لے کر کانگرس کے حلیف نیشنلسٹ علماء تک کے خشت و سنگ سے چنے گئے تھے۔

یہ بندہ ناچیز کروڑوں عام انسانوں میں سے ایک ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس معمولی حیثیت میں بھی حمیتِ حق کا ایسا جذبہ عطا فرمایا ہے کہ سنِ شعور سے اس بڑھاپے کے زمانے تک میں نے ناحق کو کبھی قبول نہ کیا۔ ناحق مسلط کرنے والے کا بلند مرتبہ مجھے کبھی مرعوب نہ کر سکا۔ کوئی کالج کا پرنسپل ہو یا کوئی یونیورسٹی کا سربراہِ شعبہ، کوئی وائس چانسلر ہو، یا کوئی وزیرِ تعلیم، کوئی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ہو یا کوئی عالمی شہرت کا مؤرخ جہاں کسی نے ناحق کا ارتکاب کیا وہیں اس کا مرتبہ میری نظر میں ساقط ہوا۔ اور میں نے اس کے برابر کھڑے ہو کر حرفِ حق بلند کیا، فہم و فراست، دیدہ و گوش اور قلب و روح کے لیے ذوق و شوق، لطف و انبساط اور سکر و صحو کی کیسی کیسی کیفیتیں اور رفعتیں کلامِ اقبال کے خوانِ یغما سے

میرے نصیب میں آئیں۔ نصف صدی کے وطن اور غربت پر پھیلے ہوئے شب و روز کا یہ قصہ کون کہے اور کون سنے یہاں تو بس یہی عرض کرنا ہے کہ میرے حق و ناحق کا شعور اور حمیّتِ حق کا جذبہ میری عزیز ترین متاع ہے اس شعور اور جذبے کے سوا کچھ بھی میرے پلّے نہیں اور اس کی پرورش سرتاسر سیرت و فکر و شعرِ اقبال سے عبارت ہے۔

اقبال نے برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں کے لیے حق خود ارادیت کی جنگ شروع کی اور قائداعظم نے اس جنگ کو فتح کے انجام تک پہنچایا۔ اس حق کی جنگ میں باطل کی قوتوں نے ملک و ملت کے دونوں محسنوں کے خلاف کیا کچھ نہ کہا اور کیا کچھ نہ کیا کون سی گالی تھی جو نہ دی کون سا الزام تھا جو نہ دھرا اور ان کی معاندت کی مہم آج تک جاری ہے۔ جی ایم سید اور خان عبدالولی خان کی قائداعظم کے خلاف یاوہ گوئی اور سردار عبدالقیوم کی علامہ اقبال کے خلاف ہرزہ سرائی اسی مہم کا حصہ ہیں۔ حق باطل کو زیر کرنے کے بعد اسے معاف کر سکتا ہے مگر باطل حق کو کبھی معاف نہیں کرتا نہ اس پر غلبہ پا کر نہ اس سے ہزیمت اٹھا کر!

یہ حرفِ حق جس کا عنوان "من اے میرِ اُمَم داد از تو خواہم" ہے، برسرِ عام آنے کے لیے مہینوں بے تاب رہا۔ اب یہ اقبال اکادمی پاکستان کی نوازش سے قارئین کی باریابی حاصل کر رہا ہے۔ محترم و مکرم جناب پروفیسر مرزا محمد منور صاحب بڑے نادر نامور ہیں وہ ناموروں کے قدرشناس تو ہیں ہی، مجھ ایسے گمنام کی دستگیری بھی کر جاتے ہیں۔ ان کا بے حد ممنون ہوں اور ان کے رفقائے کار جناب محمد سہیل عمر اور جناب ڈاکٹر

وحید عشرت صاحبان کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سورہ کی ترتیب و تدوین میں اپنے مشوروں سے نوازا اور حواشی تیار کرنے اور کتابت کے مختلف مراحل میں میری اعانت کی۔

غلام علی چودھری

دو سنگین الزام اور دو عظیم مبلّغ

حکومت آزاد جموں و کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم، علامہ اقبال اور اُن کے کلام کے بارے میں دلیس پردیس بے سروپا باتیں کہتے پھر رہے ہیں۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نے بالکل بجا کہا کہ سردار صاحب کوئی ایک موقف اختیار کریں تو ان سے بات بھی ہو۔ وہ تو کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ۔ اس کے باوجود متعدد اہلِ قلم نے ان کی گفتگوؤں کا اُلٹا سیدھا ناپنے کی کوشش کی ہے۔

قارئین کی خدمت میں یہ گزارشات بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہیں۔

سردار عبدالقیوم نے اپنی تقریروں میں اقبال کے خلاف جو سب سے زیادہ غلط اور خلافِ واقعہ بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے کلام سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا اثر سلب کر لیا اور اقبال پر جو سب سے زیادہ سنگین الزام انھوں نے لگایا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ بداعمالیوں کے مرتکب تھے۔ ان کا یہ دعویٰ قابلِ غور ہے کہ انھوں نے بداعمالی کے لفظ کا استعمال سُنّتِ مطہرہ کی عظمت قائم کرنے کی خاطر کیا ہے ورنہ "بے عملی" "کوتاہی"، "غفلت" اور "لغزش" کے الفاظ بھی ان کے ذہن میں آئے تھے۔

سُنّتِ مطہرہ عہدِ نبوی ؐ سے اب تک زندہ و پائندہ ہے اور قیامت تک زندہ و پائندہ رہے گی۔ سُنّتِ مطہرہ کا علم رکھنے والے اور سُنّتِ مطہرہ پر عمل کرنے والے ہمیشہ سے پورے عالمِ اسلام میں دین کی حجت بن کر موجود رہے ہیں، وہ اقبالؒ سے پہلے بھی موجود تھے۔ اقبال کی زندگی میں بھی اور اس کے

بعد بھی - وہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ بہتر ہے کہ کلامِ اقبال کے ہدایت اثر ہونے کا ثبوت ایسے بُزرگوں کی زبان و قلم سے مہیّا کیا جائے جن کا علم و عمل سُنّتِ مُطہّرہ سے فیض یاب تھا اور جو کسی سیاسی منصب کے طفیل دفعتاً سُنتِ مُطہّرہ کی عظمت کے علمبردار نہیں بن بیٹھے تھے بلکہ جن میں سے ایک ایک کی پوری زندگی سُنتِ مُطہّرہ کے مسلّمہ نقیب کی حیثیت سے ممتاز و معتبر رہی - اس بحث میں علمائے کرام کا ذکر ضروری ہے بالخصوص مولانا سیّد ابوالحسن ندوی کا کیونکہ آج اقبال اور کلامِ اقبال کے حوالے سے مولانا ندوی کا ایک منفرد اور امتیازی مقام ہے۔ مناسب ہے کہ آغازِ کلام انہی کے تذکرے سے کیا جائے۔

راقم مکّہ مکرّمہ میں اپنے دوست اور رفیقِ کار ڈاکٹر شاہ عبادالرحمٰن کی مہربانی سے مولانا ندوی کی خدمت میں تین بار حاضر ہوا۔ ایک نشست میں مولانا نے علامہ اقبالؒ کے بارے میں فرمایا۔ "دو ملاقاتیں ان سے لاہور میں ہوئی تھیں۔ تیسری ملاقات مدینہ منوّرہ میں ہوئی"! ظاہر ہے یہ اشارہ تھا علامہ کو خواب میں دیکھنے کی طرف جو حضرت مولانا کو مدینہ منوّرہ میں آیا تھا۔

مولانا ابوالحسن ندوی کا جو مقام علم و فضل اور دین و ادب اور تقویٰ و سلوک میں ہے وہ پورے عالم اسلام میں ہر کسی پر عیاں ہے۔ یہ شیخ با چراغ صرف اِس لیے جہان گرد بنا کہ نورِ حق سے کافر کو مسلمان اور مسلمان کو مومن بنائے۔ مولانا ندوی اپنے دوروں میں تقریروں اور ملاقاتوں سے اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بُلاتے ہیں۔ جب وہ امریکہ کے دورے پر گئے تو ڈاکٹر شاہ عبادالرحمٰن جو وہاں یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے، پورے دورے میں سکریٹری کے طور پر مولانا کے ہمراہ رہے۔ ڈاکٹر شاہ نے راقم کو بتایا کہ مولانا کے ایک لیکچر کے بعد وقت لینے والوں میں ایک تعلیم یافتہ صاحب نے جو بہت عرصے سے امریکہ میں رہ رہے تھے عرض کیا کہ "جناب دین پہ ایمان تو ہے بس کچھ یہاں کی زندگی ایسی ہے کچھ شکوک و شبہات دل و دماغ میں اُٹھتے رہتے ہیں،

ڈانواں ڈول سا ہو رہا ہوں"۔ مولانا نے صرف یہ فرمایا۔ "آپ کلامِ اقبال کا مطالعہ کرتے رہیئے"۔ ڈاکٹر شاہ کا کہنا تھا۔ "مجھے حضرت مولانا کے کلامِ اقبال سے شغف کا بخوبی علم تھا مگر جس قطعیت کے ساتھ یہ نسخہ انہوں نے تجویز فرمایا۔ اس پر مجھے بھی تعجّب ہوا"۔

انہی ڈاکٹر شاہ تک مولانا ندوی کی روایت سے بانیٔ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کا یہ فرمودہ بھی پہنچا۔ "کلام اقبال لاؤ کہ تمہیں دعوت کے اصول سمجھائیں۔ محمد عبدالملک جامعی لکھتے ہیں۔ اقبال کی وفات ہوئی تو مولانا محمد الیاس کی مجلس میں ان کا ذکر آیا۔ لوگوں نے کچھ گستاخی کی کیونکہ وہاں سب ہی مولانا حسین احمد کے ارادت مند تھے۔ مولانا الیاس نے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھی اور خاموشی کا اشارہ کیا مگر لوگوں نے انہیں وہ قطعہ یاد دلایا کہ اقبال نے مدنی صاحب کو ایسا ایسا کہا ہے۔ مولانا نے فرمایا۔ "اسے حق تھا وہ صاحب مقام شخص تھا"۔[۱]

مولانا محمد الیاس اور مولانا ابوالحسن ندوی اس صدی کے عظیم داعی و مبلّغِ اسلام ہیں۔ غور فرمایئے کہ یہ دونوں بزرگ تو کلامِ اقبال کو دین کی دعوت اور ایمان کی استقامت کے لیے مہمد قرار دیں اور سردار عبدالقیوم اس کے "باقاعدہ ترتیب کے ساتھ" پڑھنے والوں کے حق میں گمراہی کا فرمان جاری کریں۔

کلامِ اقبال اور علمائے برصغیر

اقبال کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔[۲] انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس گول میز کانفرنسیں صوبائی اور ملکی سیاست کے ہنگامے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور یورپ اور مصر و فلسطین اور افغانستان کے سفر اور علمی ادبی تقریبیں ۔ ۔ ۔ عوام و خواص

کی ہماہمی سے بھری ہوئی یہ اقبال کی اجتماعی زندگی کی کارگاہ تھی۔ ہائیکورٹ ان کی پیشہ ورانہ تگ و دو کا مرکز تھا۔ ان کا سادہ اور مختصر سا مسکن خلائق کا مرجع تھا جس کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لیے ہمیشہ کھُلا تھا اور جس کا قرینہ ان کی درویشی کا آئینہ تھا۔

علمائے دین بہت پہلے اقبال کے مقام کو جان گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی کی تیسری نشست کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ چھٹی نشست میں جس کے صدر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی تھے۔ اقبال کی خدماتِ ملّی کے اعتراف کے طور پر ان کو پھُولوں کا ہار پہنانے کی رسم ادا کی گئی۔ سیّد سجّاد حیدر یلدرم نے مولانا شبلی نعمانی سے درخواست کی کہ وُہ یہ رسم ادا کریں۔ مولانا نے فرمایا۔

"یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصوّر کرنا چاہیے ہم مُسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزّت اور خطابات کی قدر کرتے ہیں اتنی کسی اور عزّت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی ... جو عزّت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے۔ وہ ان کے لیے بڑی عزّت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزّت کے مستحق ہیں"۔

پھر مولانا شبلی نے اقبال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ اقبال کے اظہارِ تشکر کے بعد مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے اپنے صدارتی کلمات میں انہیں "میرے عزیز دوست" اور "فخرِ قوم" کے القاب سے نوازا پھر قرآن مجید کی سورہ "الشعرا" کے حوالے سے اقبال کو جاہلیت کے شاعروں سے ممیّز کیا اور انہیں "احسن القول والے ممدوح شاعر" قرار دے کر فرمایا۔

"ان کی قومی شاعری اب اس عام مقبولیت کو پہنچ گئی ہے کہ

قومی جلسوں میں مولود اور وعظ کی محفلوں میں ان کے قومی ترانے اور ان کی نعتیہ نظمیں پڑھی جاتی ہیں - ان کی شاعری کا ڈھنگ اگلے شعرا سے نرالا ہے . . . ان کا ترانہ یہ ہے۔ "زمین ہماری آسمان ہمارا چین ہمارا ہندوستان ہمارا"۔ یہاں تک کہ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا - خیر ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا کرے سارا جہان تمہارا ہو جائے اور کوئی نہ ہو تو ہم تمہارے ہیں . . . . اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مُبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرّت ہے کہ اس جلسہ میں انہوں نے علامہ شبلی کے مُقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے نام بھی مُبارک کام بھی مُبارک پھولوں کا ہار بھی مُبارک اور ہار ڈالنے والے کا دستِ کرم بھی مُبارک"۔[۳]

۱۹۱۱ء میں اقبال کو دہلی میں پھولوں کا ہار پہنانے کی یہ رسم ان کی قومی اور ملّی حیثیت کی گویا ایک سند تھی جس پر مولانا شبلی نعمانی نے اپنے دستِ مُبارک سے مُہر ثبت فرمائی۔ اس کے بعد اقبال کی زندگی کے ماہ و سال بتدریج مسلم ہند کے مستقبل کی تاریخ بنتے گئے حتیٰ کہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ الہ آباد میں قوم کو بتا دیا کہ ہندوستان کے مسلم اکثریت والے صوبوں کا آخری مُقدر کیا ہے[۴] اور پھر ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح کو مطلع کر دیا کہ صرف آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو آنے والے طوفان سے بچا سکتے ہیں[۵]۔ اس سارے عرصے میں پہلی جنگِ عظیم کے واقعات و نتائج نے ساری دُنیا کو لپیٹ میں لے لیا اور عالمِ اسلام اور مسلم ہند کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس پُر آشوب دَور میں اقبالؒ اسلامیانِ برصغیر کے نفسِ ناطقہ بن کر سامنے آئے۔ ان کے کلام میں جذبات کا لاوا پھُوٹ پھُوٹ کر بہتا رہا مگر وہ بوجوہ تحریکِ خلافت سے عملاً کنارہ کش رہے اور کمال غور و فکر اور اعجاز زبان و قلم کے ساتھ مُسلمان کا حال

دمستقبل محفوظ کرنے میں منہمک رہے۔ ان کی سرگرمیوں کا ایک نمایاں پہلو جلیل القدر دینی علمائے کے ساتھ مسلسل اور مستقل روابط تھے۔ وُہ ان سے خط و کتابت کرتے ان سے جا کے ملتے انہیں اپنے ہاں بُلاتے ان سے استفسارات کرتے ان کے جوابات سُنتے مثلاً جب مولانا سیّد انور شاہ کشمیری انجمن خدام الدین کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو اقبال نے ان کی خدمت میں کھانا کھانے کی دعوت بھیجی اور ان سے درخواست کی کہ مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیز الرحمٰن سے بھی یہی التماس ہے[۵]۔ مولانا انور شاہ نے ایک بار فرمایا تھا۔ "مجھ سے جتنا استفادہ ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے۔ کسی مولوی نے نہیں کیا۔"

ایسے ہی قدر و منزلت کے تعلقات اقبال کے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبداللہ العمادی اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری کے ساتھ تھے۔ مولانا احمد علی اور مولانا غلام مرشد کو وہ مشورے کے لیے یاد کر لیتے تھے اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری تو ان سے "پیر و مُرشد" کہہ کے خطاب کرتے تھے۔ البتہ مولانا حسین احمد مدنی سے متحدہ قومیت کے موضوع پر علامہ اقبال نے اپنے اصُولی اختلاف کا برملا اظہار کیا لیکن اس بحث میں بھی انہوں نے یہ صراحت کہا کہ میں ان کے احترام میں کسی اور مُسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اقبال کو خط لکھا کہ "رموزِ بے خودی" انہیں بہت پسند آئی[۶]

مولانا محمد علی جوہر جامعہ ملیہ میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا درس خود دیتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں فرمایا۔ "خُدا کی رحمت ہو اقبالؒ پر خوب تعلیم مولانا روم کا اتمام کر رہا ہے"۔ پھر "اسرارِ خودی" سے اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا۔ "لکھنے بیٹھا تھا خط مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف ... مگر چونکہ بہ حیثیت ادب کے اس کا پایہ میری

نثر سے اتنا ہی اُونچا ہے جتنا کہ زمین سے آسمان کا . . . اس لیے "اسرارِ خودی" کا یہ حصّہ نقل کر دیا گیا"۔[۹] مولانا اپنی نامکمل انگریزی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ جب بھی لاہور جاتا ہوں۔ سیدھا اقبالؒ کے ہاں پہنچتا ہوں اور وہیں ٹھہرتا ہوں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "وطنیت" کے اصوُل پر اسلام کے اصُول اجتماعی کو ترجیح دینے میں اقبالؒ کو "امام العصر" کہا۔[۱۰]

مولانا عبداللہ العمادی نے لکھا۔ "اقبال کا دل وحی الہٰی کا آئینہ دار ہے۔ کشف غطانے اس کے سامنے سے آسمان و زمین کے پردے اٹھا دیے ہیں"۔[۱۱]

یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ حلقۂ علماء میں اقبال کے مولانا سیّد سلیمان ندوی سے تعلّقات خاص اور اہم تھے۔ ان کی "ظاہری ملاقات" اپریل ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ جب سیّد صاحب انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو اقبال ان سے ملنے کے لیے "زمیندار" کے دفتر میں گئے جہاں وہ قیام فرما تھے لیکن سیّد صاحب خود فرماتے ہیں۔ "مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے"۔ علامہ نے انہیں کوئی ستر خط لکھے ہیں اور آخری خط مئی ۱۹۳۷ء میں یعنی اپنی وفات سے گیارہ ماہ قبل تحریر کیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر علامہ اقبال سیّد سلیمان ندوی اور سر راس مسعود ایک تعلیمی وفد کی حیثیت سے افغانستان گئے تو سفر میں معیت کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ خط و کتابت ملاقاتوں اور ہم سفری کا یہ تعلق ایک رُبع صدی پر محیط رہا۔ اس دوران میں سیّد صاحب "معارف" میں وقتاً فوقتاً کلامِ اقبال پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔

مولانا محمد علی جوہر اور سیّد سلیمان ندوی نے ۱۹۲۰ء میں ترکوں کی حمایت میں یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ اس سفر میں سیّد صاحب کو مولانا کی زبان سے "اسرارِ خودی" کے متعدد ابواب سُننے کا موقع ملا۔ سیّد صاحب لکھتے ہیں۔ "انہوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سُنائے کہ میں سراپا اثر

ہو گیا۔ شاعر نے جو کچھ کہا تھا اس کو ایک بہتر مفسر کی زبان سے سُن کر خود بخود اس کے اسرار و حکم کے عقدے وا ہونے لگے"۔ [۱۲]

"رموزِ بے خودی" کے متعلق لکھا۔ "ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں"۔ [۱۳]

"پیامِ مشرق" کا "ماہِ عید" کہہ کر استقبال کیا۔ پھر کہا کہ "یہ مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے"۔ [۱۴]

"بالِ جبریل" پر ایک طویل شذرہ تحریر کیا جو تحسین سے پُر تھا۔ "حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اس کے دامن بھرے ہیں . . . خیالات میں رفعت، اسرار الٰہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی، اجتماعیات میں حیاتِ اسلامی کی رُوح کی صحیح معرفت . . . ." [۱۵]

"ضربِ کلیم" کے متعلق لکھا۔ "حضرت اقبالؒ کی شاعری، اب شاعری کی حدود سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے اور "ان من الشعر لحکمہ" کے خلعتِ نبوی ﷺ سے سرفراز ہو چکی ہے۔ اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے . . . وہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریلِ امین کا پیام ہے"۔ [۱۶]

علامہ کے انتقال پر سید سلیمان ندوی نے جو تعزیتی مضمون تحریر فرمایا وہ

ان کے تعلق قلب و نظر کا آئینہ دار تھا۔ افسوس ہے اس کے صرف چند جملے یہاں دیئے جا سکتے ہیں۔

"وقعت الواقعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی ہے۔ ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو ۔ ۔ ۔ اُمید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار اب عرشِ الٰہی کے سائے میں ہو گا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔ خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر!"

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا۔ وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علمبردار اور تجدیدِ ملت کا طلب گار تھا اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔

"۔ ۔ ۔ واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو ہی سچے مسلمان غم خوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دُوسرا اقبال مرحوم۔ دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسُولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچا عشق ۔ ۔ ۔ خُدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے!" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اقبال کی تصنیفات زمانے میں یادگار رہیں گی ۔ ۔ ۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی ۔ ۔ ۔ نظریے ان سے بنیں گے ۔ ۔ ۔ ۔

قرآنِ پاک کی آیتوں، احادیثِ شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائیؒ کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں اِنشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید"۔

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے . . . ."

"اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دُنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبالؒ! حکمت و معرفت کا دانا اقبال . . . ! کاروانِ ملّت کا راہنما اقبال! رخصت رخصت! الوداع! الوداع! سلام اللہ علیک ورحمتہ الیٰ یوم التلاق۔

سیّد صاحب نے اقبال کی رحلت پر اپنے احباب کو خطوط لکھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام خط میں اس واقعے کو "سانحہ عظیم" کہا اور فرمایا۔ "مرحوم کی وفات پر چند رسمی غمگین لفظوں کا اظہار ناکافی ہے یہ وہ غم ہے جس کے لیے الفاظ ناکافی ہیں"۔ سیّد صاحب جب تک زندہ رہے، اقبالؒ کی یاد ان کی باتوں اور خطوں میں زندہ رہی۔

یہاں یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ مولانا سیّد سلیمان ندوی اقبال کے الفاظ میں "علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد" اور "استاذ الکل" تو تھے ہی وہ فضائے عرفان و سلوک کے "شہباز" بھی تھے جس کے "شکار" کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اگست ۱۹۳۷ء میں خود لکھنؤ تشریف لے گئے۔ ان کے چالیس روزہ قیام کے دوران سیّد صاحب نے ان سے بیعت کی سعادت حاصل کی اور پھر اکتوبر ۱۹۴۲ء حضرت تھانوی نے سیّد صاحب کو چاروں سلسلوں کی خلافت

عطا فرمائی۔

مولانا سید سلیمان ندوی جلیل القدر عالم دین و ادب اور صاحب شریعت و طریقت تھے اقبال کے کلام اور حیات و وفات کے بارے میں ان کے فرمودات دین و ادب اور شریعت و طریقت کے آداب اور تقاضوں کے مطابق تھے کیونکہ تقویٰ اور احتیاط کا معیار ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ مثلاً جب اقبال کی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے رسائل و جرائد نکلنے لگے اور مجلسیں اور ادارے بننے شروع ہوئے تو سید صاحب نے وضاحت فرمائی کہ کیا چیز اقبال کی تعلیم ہے اور کیا نہیں۔

"یہ سب کو معلوم ہے کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کر کے منزلِ مقصود کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہر شے جو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے فائل میں نکل آئے۔ وہ ان کی تعلیم ہے تو وہ سراسر غلط ہوگا بلکہ وُہی چیزیں ان کی تعلیمات کے عناصر ہوں گی جن پہ ان کے قلم نے ایک مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی اور جس منزل پہ پہنچ کر ان کے خیال کے مسافر نے اقامت اختیار کی۔"[19]

یہی حزم و احتیاط مولانا سید ابوالحسن ندوی کی کلامِ اقبال سے فریفتگی میں بھی کارفرما ہے۔ وہ صاف لکھتے ہیں۔ "میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا"[20] اس کے باوجود وہ اپنی شیفتگی کا حال "کاروانِ زندگی" میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔ میری نظر۔۔۔۔ "ضربِ کلیم" پر پڑی جس کو میں لکھنؤ کے "مکتبہ دانش محل" سے خرید کر لے آیا تھا تو میری آنکھیں کھل گئیں اور میں ان کے کلام کی بلندی اور تاثیر سے مسحور

ہوگیا لیکن "بالِ جبریل" پڑھ کر اس سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس میں خیالات کی رفعت و جدت کے ساتھ ترنّم اور حلاوت جرس زیادہ تھی پھر "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بےخودی" مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"۔ "پیامِ مشرق" اور بعد میں "جاوید نامہ" اور "زبورِ عجم" کا مطالعہ کیا۔ اور ذہن و قلب نے ان کا وہ اثر قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت کا (جہاں تک ادب و شاعری و فکر کا تعلق ہے) . . . نہیں کیا تھا۔"

"اقبال سے تاثر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاصر اہلِ قلم و اہلِ علم کی علمی تحقیقات و فتوحات . . . کے ماخذ ہم کو معلوم تھے .. اور اس میں کسی نوع کی شرکت . . . ہم کو بھی حاصل تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ محنت و مطالعہ پیش کرنے کے سلیقہ اور کہنہ مشقی سے ہم بھی اس منزل کو پہنچ سکتے یا اس کی سرحد کو چھو سکتے ہیں لیکن اقبال کے افکار و خیالات ان کے سوز و ساز کا سرچشمہ ہماری دسترس سے باہر تھا اور ہم ان کو پڑھ کر یا سُن کر محسوس کرتے تھے کہ یہ کسی اور عالم کے خیالات ہیں اور اس کا تعلق ذہانت علم اور وسعتِ مطالعہ سے نہیں "فیضان" سے ہے . . . ."

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ [۲۱]

مولانا ندوی "نقوش اقبال" میں لکھتے ہیں :

"میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اُس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دُوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے . . . اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلا سے بھی آگے

ہیں جو مغربیت سے واقف نہیں اور نہ انہیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔

آخر میں پھر کہتا ہوں کہ انہیں ہیں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خوان شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا، تو دل جوش سے اُمنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات و کیفیات کی لہریں پیدا ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رو دوڑنے لگی۔ میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے[۲۲] مغربی فکر کی مسموم اور مکدر فضا اور اسلامی دنیا کی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر ابوالحسن ندوی کہتے ہیں:

"اس شاعر کی قیمت و عظمت یقیناً بہت بڑھ جاتی ہے جو گہوارۂ اسلام سے بہت دُور ایک نومسلم برہمن خاندان اور ایسے ملک میں پیدا ہوتا ہے جہاں فرنگ اور فرنگی تہذیب کی حکومت ہو وہ عصری اور مغربی علوم و فنون کے بڑے سے بڑے مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے مگر پیغامِ محمدی پر اس کا ایمان مضبوط ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت، ان کی اُمت کی صلاحیت اور اس کے مستقبل پر اعتماد بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اسلامیت کی حمیت اور مغربی فلسفہ و تہذیب سے نفرت اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور وہ اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو اسی فکر و عقیدہ کی راہ میں لگا دیتا ہے اور صاحبِ ایمان شاعری داعیانہ نظر اور فلسفیانہ پختہ کاری کی علامت بن جاتا ہے اور اپنے افکار کی ضرب سے برصغیر کے بحر منجمد میں ایک شورش و طوفان پیدا کر دیتا ہے جس کی لہریں بحر ہند سے گزر کر ساحلِ عرب اور عالمِ اسلام کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں۔۔۔"[۲۳]

پھر بتاتے ہیں کہ انہوں نے اقبال پر کتاب کیوں لکھی اور عربی زبان میں کیوں لکھی :

"یہ کتاب عربی میں میں نے اسی لیے لکھی کہ شرقِ اوسط میں مغربی فلسفہ و تہذیب کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات میری نظر میں تھے اور میں دیکھتا تھا کہ عالمِ اسلامی و عربی کس طرح جاہلیت قدیمہ و جدیدہ کے دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی قومیّت ہے تو دوسری سمت اشتمالیت و اشتراکیت . . . اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ یہی وہ بہترین فکری ہدیہ ہے جو ہم اسلام کی نئی نسل اور اُٹھتے اور اُبھرتے ہوئے جوانانِ عرب کو دے سکتے ہیں میں یہ کتاب پیش کرتے ہوئے اُمیدوار ہوں کہ شاید اس سے عزم و ارادہ کو حرکت میں لانے، طبیعتوں کا جمود توڑنے، سوئی ہوئی غیرت و حمیت کو جگانے کا کوئی سامان اور فکر و ادب کو نیا موڑ دینے کا کوئی رُجحان ضرور پیدا ہو گا۔" [۲۴]

پھر فرماتے ہیں کلامِ اقبال کیا کیا کر سکتا ہے :

"اقبال کا کلام ہمارے شعور و احساس قلب و وجدان اور اعصاب میں حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے اور پھر ایک ایسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اُٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادّیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقت ور ایمان، پُر درد و پُرسوز اور بے چین رُوح رکھتا ہے۔" [۲۵]

اور کلامِ اقبال نے کیا کام کر دکھایا ! لکھتے ہیں ۔

"بلاشبہ اقبال کی شاعری نے خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا اور ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی چنگاری پیدا کر دی"۔[۲۶]

اور پھر یہ شعر نقل کرتے ہیں . . .

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
جوانوں کو مری آہِ سحر دے
تو اِن شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور فرماتے ہیں :-

"اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعائیں بے اثر نہیں گئیں اور آج سارے عالمِ اسلام میں خالص اسلامی فکر و نظر لیے نوجوانوں کی ایک نئی نسل اُبھر رہی ہے"۔[۲۷]

اقبال اور بلادِ اسلامیہ

کیا یہ امر غور طلب نہیں کہ اقبال کے جاننے اور ملنے والے اتنے جید اور عظیم علمانے جو سنتِ مطہرہ کے عالم و عامل تھے اقبال کے مقام و مرتبت کو ملحوظ رکھا ہے اور کلامِ اقبال کے ہدایت اثر ہونے پر خراجِ تحسین کے ساتھ شہادت دی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اقبال کم و بیش تیس برس ملک و ملت کی کروڑوں آنکھوں کے سامنے علم و ادب اور دین و سیاست کے آسمان پہ آفتاب بن کر چمکے ایسا آفتاب جس کی ضیا پاشیاں اور حرارت آفرینیاں اس کے غروب کے نصف صدی بعد بھی نصف النہار کی شان رکھتی ہیں اور عالمِ اسلام بالخصوص ان سے روز بروز زیادہ سے

زیادہ تب و تاب حاصل کر رہا ہے کیونکہ برصغیر سے باہر دیگر بلادِ اسلامیہ میں بھی اقبال کا قافلۂ شوق رواں دواں ہے۔ اصل میں وہاں بھی علامہ اقبال کی قدر و منزلت ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد روم سے ہوتے ہوئے جب اقبال یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو مصر پہنچے تو ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ اسکندریہ اور قاہرہ میں مصری حکومت کے نمائندوں، علماء ازہر، سیاست دانوں، صحافیوں، شبان المسلمین کے ارکان اور چند شامی ایرانی میزبانوں سے ملاقاتوں اور ضیافتوں سے زیادہ توجہ کے لائق شاید یہ واقعہ ہے کہ ابوالعزائم سید محمد ماضی جو مصر کے مشہور روحانی پیشوا تھے اپنے دو صاحبزادوں کے ہمراہ اقبال سے ملنے کے لیے ان کے ہوٹل میں آ گئے۔ اقبال ان کے یوں تشریف لانے پر بیحد پریشان ہوئے۔ عرض کیا :

"حضرت آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔"

انہوں نے فرمایا :

"خواجۂ دو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔ لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں کہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں۔" [۲۸]

یہ سن کر اقبال بے چین ہو گئے اور ان سے کچھ کہا نہ گیا چپ بیٹھے سید ابوالعزائم کے پند و نصائح سنتے رہے۔ وہ تشریف لے گئے تو اقبال کا ضبط ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کے دھارے چھوٹ پڑے۔ فرمایا۔

"ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاںؐ کے ارشاد کے اتباع میں بغرضِ خوشنودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملنے آتے ہیں۔"

اگلے دن جب اقبال ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور دُوسرے اہلِ علم سے ملاقاتوں میں مصروف تھے۔ سید ابو العزائم کے صاحبزادے کار لے کے آ گئے کہ والد صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ اقبال وہیں سے ان کے مکان پر حاضر ہوئے وہاں ان کے بہت سارے مرید موجود تھے۔ سید ابو العزائم نے مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے کہا کہ کفّار کروڑوں مسلمانوں پر اس لیے مسلط ہیں کہ انہوں نے اسلام کی رُوح کو ترک کر رکھا ہے پھر انہوں نے اقبال کے دل کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

"اس دل میں اسلام کی محبت اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خاص شیفتگی نظر آتی ہے"۔ [۳۵]

رخصت کے وقت شیخ کے مُریدوں نے حضرت اقبال زندہ باد کے نعرے بلند کیے۔

اقبال کے مصری عقیدت مندوں کے سرخیل ڈاکٹر عبد الوہاب عزام ان سے مصر اور ہندوستان میں کئی بار ملے اور انہوں نے ان کے بیشتر فارسی کلام کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان کی حیات اور فکر و فلسفہ پر ایک کتاب بھی لکھی جس میں وہ اقبالؒ کو شاعرِ اسلام، شاعرِ مشرق، شاعرِ حیات، شاعرِ انسانیت، شاعرِ جہاد، شاعرِ حریت، شاعرِ جلال اور شاعرِ جمال کے القابات کے ساتھ سلام کرتے ہیں[۳۶]۔ اقبال کی نظم و نثر کے دیگر عربی مترجمین میں الصاوی شعلان ڈاکٹر سمیر عبد الحمید ابراہیم اور عباس محمود شامل ہیں اقبال کے شعر و فکر پر لکھنے والوں میں نجیب الکیلانی اور مراکشی عبد الکریم خطیب بھی ہیں۔ الجزائری مفکر مالک بن نبی اور شامی دانشور جودت سعید اقبال کے عقیدت مندوں میں ہیں۔ اخوان المسلمون کے رہنما اور معاون مصری ڈاکٹر سعید رمضان سے لے کر شامی شیخ سعید طنطاوی تک سبھی اقبال کے دلدادہ ہیں مشہور عراقی خطیب شیخ محمود صواف اور ان کے فرزند ڈاکٹر مجاہد صواف اپنی نشستوں اور گفتگوؤں میں اقبال کے اشعار عربی ترجمے میں سُناتے ہیں شیخ جودت سعید تین سال قید رہنے کے بعد رہا ہوئے تو جیل کے دروازے

پر اپنے مداحوں سے جو بات انہوں نے سب سے پہلے پوچھی وہ یہ تھی، اقبال کا کوئی اور مجموعۂ کلام عربی میں ترجمہ ہوا اس دوران میں ؟ ترکی ریسرچ سکالر ڈاکٹر نجاتی از ترک جن کی راقم سے پہلی بار ملاقات ایڈنبرا میں ہوئی بتا رہے تھے ترکیہ کی سلامہ پارٹی کے رہنما جناب اربکان اور ان کے رفقاء ترکی شہروں کے گلی کوچوں میں تقریریں کرتے ہیں تو اقبالؒ کے شعر پڑھ پڑھ کر خود بھی روتے ہیں اور سامعین کو بھی رُلاتے ہیں اور یوں حمیت اسلام جگاتے ہیں۔ انہوں نے راقم کو ایک خوبصورت کتاب دی جو اقبال کے منتخب کلام کا ترکی ترجمہ تھا۔ شامی ادیب یوسف عبدالودود صرف "ضربِ کلیم" کے عربی ترجمے کی تلاش میں شام سے مصر گئے کیونکہ دمشق میں اس کے سب نسخے فوراً ہی بک گئے تھے مگر قاہرہ میں بھی انہیں ہر کتب فروش سے یہی جواب ملا۔ آخر قاہرہ کی ایک لائبریری میں ایک نسخے کا سُراغ چلا۔ وہ صبح سے شام تک ریڈنگ رُوم میں بیٹھتے اور نقل کرتے۔ دس روز میں پوری کتاب کی نقل مکمل کر کے دمشق واپس آئے اور دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ میرے پاس "ضربِ کلیم" ہے! میرے شامی دوست ڈاکٹر عبداللطیف الخیاط سے مثنوی "اسرار و رموز" کی بات ہوئی تو بولے "میں نے کوئی چھ سات بار پڑھی ہے"۔ پھر کہنے لگے۔ "میں دل کا قدرے سخت ہوں۔ آنسو نہیں بہاتا مگر جب بھی "رموزِ بے خودی" میں اقبال کے لڑکپن کی سائل والی نظم پڑھی ہے چیخ چیخ کے رویا ہوں اور بالکل یہی حال میرے بڑے بھائی مروان کا ہے"۔ ڈاکٹر خیاط نے یہ بھی بتایا کہ اقبال کا ملّی ترانہ سکول کے زمانے میں سیکھا۔ سبھی بچے گلیوں بازاروں میں گاتے پھرتے ہیں۔ پتہ بھی نہ تھا کہ یہ ترجمہ ہے ایک مصری مدرس عبدالعلیم نے بتایا کہ عربی ترجمے میں اقبال کی نظمیں مصری سکولوں کی درسی کتب میں شامل ہو چکی ہیں۔ سعودی عمید ڈاکٹر عدنان وزان نے کہا کہ "عرفہ کی وہ شب کون بھلا سکتا ہے جب مصر کی مشہور اور عظیم مغنیہ اُمِّ کلثوم نے اقبالؒ کے شکوہ اور جوابِ شکوہ" کے عربی ترجمے کا ایک حصّہ

"حدیث الروح" کے عنوان سے گایا۔ سارے عالمِ عرب میں تہلکہ مچ گیا اور عراق سے مراکش تک ہر طرف ہیجان کی لہریں پھیل گئیں! ایرانی ملک الشعراء بہار نے کہا تھا قرن حاضر خاصۂ اقبال گشت ایران کے نئے متدین رہنماؤں نے علامہ اقبال کو اسلامی انقلاب کے مفکروں میں شامل کر لیا ہے کیونکہ انہوں نے اقبال کے فکر و نظر سے ہدایت حاصل کی ہے۔ جمہوریہ اسلامیہ ایران کے صدر علی خامنہ ای شالامار میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے دیے گئے استقبالیے میں ساری دنیا کے سامنے فرما گئے کہ میں مُریدِ اقبال ہوں!

قیامت انگیز اثر، ایک رباعی، ایک مصرعہ

برصغیر سے آگے بڑھ کر بلادِ اسلامیہ میں علامہ اقبال کے مقام و منزلت اور ان کے کلام کی قدر و وقعت کا یہ مختصر اور کسی حد تک نمائندہ جائزہ اس لیے لیا گیا کہ یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آسکے کہ آج پوری دُنیائے اسلام میں جہاں جہاں بھی مسلمان کا فکرِ عزم، ہمت، خلوص اور جذبہ ملّت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سرگرم ہے۔ اکثر و بیشتر کلامِ اقبالؒ بھی اس کا شیرازہ بند اور راہبر ہے۔ لہٰذا سردار عبدالقیوم کا یہ کہنا کہ کلامِ اقبالؒ سے ہدایت کا اثر اللہ تعالیٰ نے سلب کر لیا ہے نہایت ہی لغو اور مضحکہ خیز بات ہے۔ سطور بالا میں بعض شواہد اور واقعات سے اس کا جو رد کیا گیا وہ زیادہ تر علمی، ادبی، ملّی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے کیا گیا یعنی علم و ادب اور دین و سیاست کے حوالے سے بلکہ بالخصوص کتاب و سنت کے عالمان باعمل کے حوالے سے۔ اس نقطۂ نظر کے علاوہ بھی ایک نقطۂ نظر ہے اور وہ ہے ذاتی انفرادی انسانی اور فطری نقطۂ نظر۔ اقبالؒ کے کلام میں جو ساحرانہ اثر ہے وہ پڑھنے والے کی زندگی میں، اس کی دنیائے عمل میں اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقبالؒ کے اَن گنت عقیدت مند اس کا ثبوت اپنی زندگیوں میں ضرور پاتے ہوں گے۔ کاش ان میں سے ہر کوئی اس نعمت کی تحدیث کر سکتا۔ کاش آج بھی ایک دفتر "اقبالؒ

سے میں نے کیا پایا" کے عنوان سے مُرتب کرنے کا موقع اقبالؒ کے شکر گزاروں کو مل سکے! دیکھئے اللہ کا ایک بندہ کیونکر اپنی احسان مندی کا اظہار کرتا ہے۔ جناب قمر تابش لکھتے ہیں۔

"اقبالؒ سے میرا پہلا ذہنی رابطہ اس وقت قائم ہوا۔ جب میں نے ان کا یہ شعر پڑھا یا سُنا ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

"بچپن کے بعد پھر عمر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ... علامہ صاحب کا بھرپور تعارف ہوا اور ان کی شخصیت ایک محسن کی صورت دِل وجان میں سما گئی ....."

"ان کے کلام سے ذاتی استفادہ کرتے ہوئے میں نے رزقِ حلال کی تلاش کو مُسلمانی کا پہلا اصُول بنا لیا ہے اس طرح میں انتشار ہوس زر سے بے نیاز نہایت ہی امن سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ علاّمہ کے اصطلاحی اشاروں کی جب بھی تحقیق کی ہے۔ صحابہ کرام کی حیاتِ طیبہ ہی سامنے آتی ہے جس کا مفہوم پاکیزگیٔ چشم وگوش اور رزقِ حلال کا حصُول ہی نِکلا ہے جسے عرفِ عام میں سادگی کہا گیا ہے۔ بندۂ ناچیز یہ سب کچھ اپناتے ہوئے ابتلا میں بھی خوش وخرّم زندگی گزار رہا ہے۔"[۳۲]

مولانا سیّد ابوالحسن ندوی کا یہ قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ ادب وشاعری وفکر کے میدان میں ان کے ذہن وقلب نے جو اثر علاّمہ اقبالؒ کا قبول کیا۔ کسی معاصر شخصیت کا نہیں کیا۔ اپنی مبلغانہ جدّوجہد کا جو ایشیا اور افریقہ سے آگے یورپ اور امریکہ تک جاری ہے ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے اطراف واکناف عالم میں "تکبیر مسلسل" بلند کرنے کو کنجِ عزلت میں "تسبیح ومناجات" میں مشغول رہنے پر

ترجیح دی ہے اور اپنے فیصلے پر اقبالؒ کے ان دو شعروں کا حوالہ دیا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملاّ و جمادات و نباتات

اقبالؒ کی اسی بے مثال اثر آفرینی کے ضمن میں اس رُباعی کا ذکر برمحل ہو گا جس کو سردار عبدالقیوم نے ان کے احساسِ ندامت کے ثبوت میں پیش کیا ہے ؎

بہ پایاں چوں رسد این عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را!
حساب من ز چشم او نہاں گیر

سردار عبدالقیوم اس رُباعی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال کی گریہ وزاری اور پشیمانی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور ان کی بخشش کے امکان کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے وہ "ایک اور رُباعی" کا حوالہ دیتے ہیں۔ "جو چھوڑ دی تھی انہوں نے"۔ وہ رُباعی یہ ہے ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر!
از نگاہِ مصطفےٰؐ پنہاں بگیر

اس رُباعی کی طرف سردار عبدالقیوم کا مبہم اشارہ اور اس کے چھوڑ دینے کی بات سامعین کے ذہن میں شکوک پیدا کر سکتے ہیں اور یہی ان کا مقصد نظر آتا ہے حالانکہ دونوں رُباعیوں کا مضمون ایک ہی ہے اور ایک عام قاری کے لیے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہو گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ سید ابوالحسن ندوی اسی "چھوڑی" ہوئی

رُباعی کی تعریف و توصیف میں بے اختیار سر دُھنتے ہیں کہ کیا عجیب عاشقانہ رمز اقبال نے اس میں بھر دی ہے!

اقبال نے یہ رُباعی کیوں "چھوڑ دی"؟ کیوں اپنے کلام میں شامل نہ کی؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کلامِ اقبالؒ کی سحر طرازی اور اثر انگیزی کی ایک لاثانی مثال ملتی ہے اور وہ یُوں کہ یہ رُباعی مولوی ابراہیم سب جج گوجرانوالہ نے محمد رمضان انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان کے سامنے پڑھی وہ صوفی طبیعت آدمی تھے اِتنا شدید اثر ان کے دل پر ہوُا کہ دفعتاً گرے اور چوٹ کھا کے بیہوش ہو گئے انہوں نے بعد میں اقبال سے بذریعہ خط التجا کی کہ یہ رباعی مجھے بخش دیں تاکہ مرنے کے بعد یہ میرے ماتھے پر لکھ کر مجھے دفن کیا جائے۔ علامہ نے جواباً تحریر فرمایا:

"شعر کسی کی ملکیت نہیں آپ بلا تکلف وہ رُباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے اپنے نام سے مشہور کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

لہٰذا یہ کھلا کہ علّامہ نے چونکہ یہ رُباعی ماسٹر محمد رمضان کو عطا فرما دی تھی اس لیے ان کے کلام کی تدوین میں اسے چھوڑ دیا گیا لیکن سردار عبدالقیوم خُدا جانے اپنے سُننے والوں کو کیا سمجھا رہے تھے! اس مثال سے معاملے کا یہ پہلُو سامنے آتا ہے کہ ان رُباعیوں کو پڑھ کر مولانا ابوالحسن ندوی اور ماسٹر محمد رمضان جیسے خواص اور ہزاروں عوام اپنے محاسبے میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب کہ سردار عبدالقیوم انہیں پڑھ کر اقبال کے محاسبے پر مامُور نظر آتے ہیں۔

کلامِ اقبال کی تاثیر کے سلسلے میں ایک اور واقعہ مولانا ابوالحسن ندوی کا یاد آ گیا جو ڈاکٹر شاہ عبادالرحمٰن نے حضرت مولانا کے قریب ترین ارادتمندوں سے سُنا ایک خصوصی مجلس میں ایک صاحب اقبالؒ کی مشہور نظم "میں اور تُو" پڑھ رہے تھے جب وہ اس شعر پر پہنچے۔

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری" (بانگ درا)

تو حضرت مولانا پر شدید رقت طاری ہوئی اور وہ دیر تک بے اختیاری کے عالم میں ہچکیوں کے ساتھ روتے رہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے سچ ہی تو فرمایا تھا۔

"ایک عالم ان کے نغمے سے سرشار و مست تھا اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز اثر پیدا کر رہا تھا" اور[۳۴]

"یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُترے"۔

سید سلیمان ندوی کا یہ اقبال کے ہر مصرعے کی تاثیر والا دعویٰ حرف بہ حرف صحیح ہے لفظاً بھی اور معناً بھی۔ پوری توجہ فرمایئے یہ ایک قیدی اپنا تجربہ بیان کر رہا ہے۔

"میں جیل میں بہت پریشان تھا۔ سال سوا سال رہا۔ ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل کے نام ایسا اخبار آیا جو عام طور پر نہیں آتا تھا۔ میں نے اُٹھایا تو سرورق لکھا ہوا تھا۔

مجھے ہے حکم اذان لا الہ الا اللہ ۔ ۔ ۔

میری ساری پریشانی دُور ہو گئی۔"

قارئین جانتے ہی ہیں یہ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مگر شاید انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ قیدی کون تھا۔ یہ قیدی وہی سردار عبدالقیوم صدر حکومت آزاد جموں و کشمیر ہیں جو ناروے میں فرما کے آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کلامِ اقبال سے ہدایت کا اثر سلب کر لیا ہے لیکن کلامِ اقبال کا جادو روزنامہ جنگ کے فورم میں ان کے سر چڑھ کے بولا اور ان سے اس حقیقت کا اظہار ہو ہی گیا کہ ان کی سال سوا سال کی اسیری کی ساری پریشانی اقبال کے ایک مصرعے سے دُور

ہو گئی تھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس ہدایت یافتہ ظاہری سُنّت کے پابند آدمی کو آزمائش کے وقت میں اقبال کے ایک مصرعے نے یُوں استقامت دی اس نے مروّت کا تقاضا کیوں نہ ملحوظ رکھا۔ اقبال کے لیے دل میں ممنونیت کیوں محسوس نہ کی اور زبان سے اس کا اعتراف کیوں نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"کیا بدلہ ہے احسان کا سوائے احسان کے"

اور حضور رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔

"جو بندے کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا"۔

سردار عبدالقیوم نے نہ صرف احسان فراموشی کی نہ صرف ناشکرا پن دکھایا بلکہ محسن کو گالی دی۔ اقبالؒ کے کلام نے سردار عبدالقیوم کی جیل میں پریشانی دُور کی لیکن سردار عبدالقیوم نے اقبالؒ کی موت کے تقریباً پچاس سال بعد دیس پردیس میں اپنوں پرایوں کے سامنے اقبال کی غیبت کی اور ان پر بد اعمالی کا الزام دھرا۔

سردار عبدالقیوم نے اقبال سے حُسنِ ظن نہیں سوءِ ظن روا رکھا اور اقبال کی غیبت کی اس حال میں کہ اقبال اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ سورۂ حجرات میں فرماتا ہے۔

"اے ایمان والو بچتے رہو بہت ظن کرنے سے بعضا ظن گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو سو کراہت آتی ہے تم کو اس سے ڈرتے رہو اللہ سے . . . ."

اور حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ مسلمانوں میں کون افضل ہے تو فرمایا۔

"جس کی زبان اور ہاتھ سے دُوسرے مُسلمان سلامتی میں رہیں"۔

اب اگر غیبت کسی مرحوم کی ہو تو معاملے کی صورت کیا ہوگی؟ شاید اس سوال کا جواب سردار عبدالقیوم اور ان کے پسندیدہ علماء دین جو بقول ان کے اقبال کے خلاف

ان کی دشنام طرازی اور الزام تراشی کو حلال قرار دے رہے ہیں یہ دیں گے کہ یہ غیبت مباح ہے کیونکہ کلامِ اقبال کی وجہ سے لوگوں کی دین سے گمراہی رد کرنے کے لیے کی گئی ہے۔

گمراہ معتبر گواہ

یہ دیکھئے اقبال کے خلاف بداعمالی کا الزام کیسے تیار ہوتا ہے۔ سردار عبدالقیوم کہتے ہیں۔

"میں نے ڈاکٹر کے دوستوں کو رفیقوں کو اس کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو دیکھا کہ وہ گمراہی کی باتیں کرتے ہیں روزے نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں ڈاکٹر روزہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر نماز شماز نہیں پڑھتا تھا۔ . . ." (ناروے ۲)

"اقبال پڑھنے والا ایک ایسا شخص بھی میں نے دیکھا ہے کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ جب وہ اذان سنتا تو اُٹھ کر کہتا کہ مولوی نے بھونک لیا ہے میں بھی بھونکتا ہوں۔ پھر نماز کا وقت آتا تو بے تکلف دوستوں سے کہتا کہ جاؤ تمہاری پوجا پاٹ کا وقت ہوگیا ہے۔ ایسے کئی واقعات میرے پیش نظر تھے۔" (لاہور ۳)

اس اقتباس کا ایک تاثر تو یہ ہے کہ سردار عبدالقیوم کے نزدیک اقبال کے یہ "دوست" "رفیق" اور "ان کی" مجلس میں بیٹھنے والے" اور یہ "اقبال پڑھنے والا" اور "ایسے کئی واقعات" میں ملوث افراد گمراہ تھے اور دُوسرا تاثر یہ ہے کہ سردار عبدالقیوم کے خیال میں ان افراد کو اقبالؒ کی صحبت اور کلامِ اقبال کے مطالعہ نے گمراہ کیا۔

اب صورت یہ ہے کہ جن افراد کے قول و فعل سے سردار عبدالقیوم نے خود یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گمراہ ہیں انہی افراد کی اقبالؒ کے بارے میں کہی ہوئی باتوں کا سردار عبدالقیوم نے اعتبار کیا یعنی انہوں نے گمراہوں کو معتبر مانا۔ ایک سوال یہ ہے کہ روزہ اور نماز ترک کرنے اور شعائر دینی کی تضحیک کرنے والوں کی گواہی معتبر جاننے کے لیے سردار

عبدالقیوم کے پاس مروجہ یا شرعی قانون شہادت کی رُو سے کیا جواز موجود ہے ؛ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ کہاں کی دیانت ہے کہ ان گمراہ معتبروں کی روایتوں کی بناد پر سردار عبدالقیوم ان کی گمراہی کو اقبالؒ اور کلامِ اقبال کے کھاتے میں ڈال دیں؟ کیا (بزعمِ خود) "ظاہری سُنّت کی پیروی کرنے والے سردار عبدالقیوم کے (بقول انہی کے) "ظاہری سنت کی پیروی نہ کرنے والے اقبال" پر اتنے فائق حقوق قائم ہوگئے کہ قانون، انصاف، دیانت اور اخلاق کا کوئی تقاضا ان کا دامن گیر نہ ہو سکا اور اقبال اپنی قبر میں بھی ان کی زبان سے سلامتی میں نہیں رہ سکے ؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ سردار عبدالقیوم نے اقبال نے اقبال کی بداعمالی کا چرچا اس لیے کیا کہ ان کے نزدیک ان لوگوں کی گمراہی کے اصل ذمہ دار اقبال تھے ؟

اقبالؒ اس دنیا میں نہیں ہیں انہیں یہاں سے رخصت ہوئے نصف صدی ہو چکی ہے لیکن ان کے کچھ اور "دوست" اور "رفیق" اور ان کی "مجلس میں بیٹھنے والے" اور کچھ اور "اقبال پڑھنے والے" بھی ہو سکتے تھے جو نماز روزے کی پابندی اور ظاہری سُنّت کی پیروی کرنے والے راست رو لوگ تھے اور شاید خال خال اب بھی ہوں۔ عجیب بات ہے کہ سردار عبدالقیوم نے ان کو معتبر نہ جانا اور ان سے ان باتوں کی تصدیق و تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی جو ان کے گمراہ معتبر گواہوں نے ان سے کہی تھیں۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سُنائی بات کو بغیر تحقیق کئے آگے بیان کر دے"

سردار عبدالقیوم کی بڑی کم نصیبی ہے کہ وہ گمراہ لوگوں کے سبب سے کلامِ اقبالؒ سے مستفید اور مستفیض نہ ہو سکے ورنہ ممکن تھا کہ ارکانِ اسلام اور شعائرِ دین کے خلاف دریدہ دہن لوگوں کی ضلالت کا مجرم وہ اقبال کو نہ گردانتے۔ اذان کو "مولوی کا بھونکنا" اور نماز کو "نماز شماز" کہنے والوں کی اس مرد صاحبدل اور درویش خدامست سے کیا دوستی یارفاقت یا ہم نشینی ہو سکتی ہے جس کے پاس اذان اور نماز کے متعلق اتنی ارفع و اعلیٰ کہنے

کی باتیں ہوں۔ یہاں حضرت بلال رضؓ سے خطاب ہے ؎

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذان ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
(بلال رضؓ)

یہ رومی سکندر اعظم پر حبشی حضرت بلال رضؓ کی ابدی فوقیت کا بیان ہے ؎

لیکن بلال رضؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نور نبوّت سے مستنیر
جس کا امین ازل سے ہوا سینۂ بلال رضؓ
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے !
(بلال رضؓ)

یہ اذان کی ہمہ گیر ہیبت کا ذکر ہے ؎

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار
(اذان)

یہ سپین کے شاندار اسلامی دَور کی درد بھری یاد ہے ؎

مِٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین آسمان
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذان
(مسجد قرطبہ)

ہسپانیہ! تو خونِ مسلماں کا امیں ہے!
مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
(ہسپانیہ)

اذان ظلمتِ وجود سے نورِ ایمان پھوٹنے کا اعلان ہے ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا
(صبح)

اور اس مصرعے میں بھی تو اذان ہی گونج رہی تھی جس نے سردار عبدالقیوم کی اسیری کی ساری کلفت دُور کر دی تھی۔ افسوس انہیں یاد نہ رہا ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ
(لا الٰہ الا اللہ)

نماز کے اسرار و حکم یوں کھُلتے ہیں ؎

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(نماز)

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پہ حرام
(ساقی نامہ)

دیکھئے اقبال کیسی اذان اور کیسی نماز کے جویاد ہیں۔

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود!
اَب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز
بے تب و تاب دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلمان کا سجود
(مسجد قوت الاسلام)

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
(بالِ جبریل)

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
(بال جبریل)

اذان اور نماز کے متعلق یہ چند جستہ برداشتہ اشعار ہیں ورنہ کلامِ اقبال میں قریب قریب سبھی معتقدات و عبادات و شعائرِ اسلامی پر بے شمار کافی و شافی ارشادات موجود ہیں۔ جہاں تک ظاہری سنت کی پیروی کرنے روزہ رکھنے اور نماز باقاعدگی سے پڑھنے کا تعلق ہے یہ مسلّم ہے کہ اقبال نے بچپن ہی سے صوم و صلوٰۃ کی پابندی کی تربیت پائی تھی۔[۳۶] بعد میں ان کے باقاعدہ روزہ نہ رکھنے کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ یہ تصریح نہیں ملتی کہ جب وہ روزہ نہیں رکھتے تھے تو کیا کوئی عذر ہوتا تھا اور کیا کسی اور کو روزہ رکھواتے تھے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ تیس برس کی عمر سے دردِ گردہ اور نقرس کے مریض چلے آرہے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد بڑی خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ تاکہ شب کے پچھلے حصّے میں اُٹھ سکیں۔ ۱۹۱۶ء میں مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک خط میں خود لکھتے ہیں۔

"صبح چار بجے کبھی تین بجے اُٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد نہیں سونا۔ سوائے اس کے کہ مصلّے پر کبھی اُونگھ جاؤں"۔[۳۷]

اقبال کے دشمن جن میں کانگریسی علما، پنجاب کے کچھ متعصب ہندو اور اقبال کے بعض ہم مذہب ہم پیشہ منافق دوست شامل تھے اپنے اپنے مقاصد کے لیے ان کی کردار کشی کے لیے قصّے گھڑتے رہتے تھے لیکن اقبال۔ خود بھی اپنی زندی کی تشہیر کرتے تھے۔ اس زندی کی حقیقت ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے سُنیے :۔

"اقبال کی زندی کوئی راز نہیں لیکن یہ زندی بیش تر لفظی اور خیالی زندی تھی۔۔۔۔ اقبال پر کبھی زندی غالب نہیں آئی۔ زندی پر اقبال ہی غالب رہا ہے میں اس وثوق سے اس لیے کہتا ہوں کہ اقبال نے کبھی اپنی پردہ پوشی نہیں کی۔ ہم نے جو سوال کیا اس کا صاف جواب دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی میں کوئی چھپانے کے قابل بات ہی نہیں تھی۔۔۔۔ میں اقبال کو ولی نہیں کہتا لیکن ایسا تہجد خوان، عاشقِ رسولؐ، اولیاء کا خادم اور عقیدت

گزار، خوش عقیدہ، گداز قلب مسلمان انگریزی دانوں میں کم دیکھا ہے مگر مزاج میں رندی موجود تھی۔ اچھی شکل کو اچھی شکل سمجھتے تھے لیکن عاشقی کے گنہ گار کبھی نہیں ہوئے۔ عمل میں توازن تھا طبیعت میں شاعری"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اقبال میں ملامتیوں کا سا رنگ پاتے ہیں۔

"اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے۔ عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے ان میں کچھ فرقۂ ملامتیہ کے سے میلانات تھے جن کی بناء پر اپنی زندی کے اشتہار دینے میں انہیں کچھ مزا آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے ..... اخیر زمانہ میں طبیعت کی رقّت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں"۔[۳۹]

اب جو اللہ کا بندہ چھپ کر نماز پڑھے اسے صاحب ترتیب کون کہے؟ جو خود کو کردار کا غازی نہ جانے اسے کردار کا غازی کون مانے؟ اقبال کے دنوں کی تپش اقبال کی شبوں کا گداز اقبال کے ظاہر کا مسئلہ نہیں تھا۔ اقبال کے باطن کا معاملہ تھا۔ اقبال کا زمانہ بھی اور تھا۔ ایک تو ان دنوں عبادات کے حساب کتاب اور جانچ پڑتال کا زیادہ رواج نہیں تھا دوسرے عبادات ابھی بازار سیاست کی باقاعدہ جنس نہیں بنی تھیں اور ان کے اعداد و شمار اکٹھے نہیں کئے جاتے تھے کہ دوست دشمن ان کا حوالہ دے سکیں۔ ان حالات میں اقبال کی خفیہ نمازوں اور گاہ گاہ روزوں کے روزنامچے اور گوشوارے کون بناتا اور کس محتسب کے دفتر میں جمع کراتا۔ پھر بھی ان کی دو چار نمازیں ریکارڈ پر آ گئی ہیں یعنی ان کا ذکر ان کی اپنی اور دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک تو وہ تحیت کی نماز تھی جو اقبال نے مسجد قرطبہ کی ویرانی کے چار سو سال بعد اس میں ادا کی۔ یہ نماز تاریخی اہمیت اختیار کر گئی اور اس

کا بڑا چرچا ہوا۔

ایک اور نماز جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ اقبال نے اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل کے قصر دلکشا میں پڑھی تھی۔ وہ افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ سے ملنے گئے وہیں گفتگو کے دوران نماز عصر کی اذان ہو گئی۔ بادشاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی۔ اقبال نے کہا۔ "نادر! میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ آج جبکہ خدا نے فقیر کی اس مُراد کے پُورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ کو کرنی ہو گی" [۴۰]

اقبال نے ایک نماز جمعہ بھی کابل کی سب سے بڑی مسجد "پل خشتی" کے مقصورہ میں نادر شاہ کے ساتھ ادا کی (یاد رہے کہ انگریزوں کے عہد میں اکثر مسلمان بزرگ برصغیر میں نماز جمعہ کے فرض ہونے میں کلام رکھتے تھے) [۴۱]

ایک اور نماز اقبال نے ترکی ہلالِ احمر کے وفد کے ساتھ اس کے لاہور میں قیام کے دوران پڑھی۔

محترمہ ڈورس احمد جو ۱۹۳۵ء میں اقبال کے بچوں کی اتالیق بن کر "جاوید منزل" میں آئیں اور ان کی وفات کے بعد ۱۹۶۲ء تک وہیں رہیں۔ وہ اقبال پر اپنی کتاب میں لکھتی ہیں

> "ڈاکٹر صاحب گہرے دینی مزاج کے آدمی تھے۔ وہ پانچوں وقت نماز ادا کرتے تھے۔ بیماری کے سبب سے قیام اور رکوع نہ کر سکتے تھے اس لیے بستر پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ قرآن مجید ہمہ وقت پلنگ کے قریب رکھتے۔ اکثر اس کا مطالعہ کرتے اور تلاوت کے دوران شدتِ جذبات سے بار بار بے اختیار روتے۔" [۴۲]

اقبال کا پابندی سے عیدین کی نماز کے لیے جانا ثابت ہے۔

سطور بالا میں موجود اشارات کی بنا پر گمان غالب ہے کہ اقبال نے ہزارہا نمازیں پڑھی ہوں گی۔

یہ بیان مبالغہ آمیز نہیں کیونکہ آخر شب تین چار بجے اُٹھنے کی عادت تو اقبالؒ کو لڑکپن ہی سے تھی۔ تاہم اتنی دور سے نہیں تو ان کے محولہ بالا خط کی تاریخ ۱۹۱۶ء ہی سے موٹی سی آسان گنتی کی جلئے تو ان کی صرف تہجد اور فجر کی نمازوں کی تعداد بحساب دو نماز یومیہ، بیس سال کے سات ہزار دو سو دنوں میں چودہ ہزار چار سو بنتی ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ نمازیں پڑھتے رہے ہوں (جس کا غالب امکان ہے) تو پتہ نہیں یہ تعداد کہاں تک جا پہنچے کیونکہ چھپ کر پڑھنے دلے کا کیا اعتبار کہ کتنی پڑھتا ہو۔ ایک دو پانچ سات (بشمولہ تہجد اور اشراق کے) یا پھر کوئی بھی نہ پڑھتا ہو!

ہو سکتا ہے سردار عبدالقیوم کے لیے محترمہ ڈورس احمد کی شہادت کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول اور ناکافی ہو ایک تو اس لیے کہ وہ اقبالؒ کی ملازمہ تھیں دوسرے اس لیے کہ وہ عورت ہیں۔ تیسرے اِس لیے کہ وہ اقبالؒ کی زندگی کے صرف آخری تین سال کی شاہد ہیں اور چوتھے اِس لیے کہ ان کی مذہبی معلومات کا پس منظر غیر اسلامی تھا۔ اقبالؒ کی اگر یہی نمازیں ہمسایوں، محلّے کے لوگوں اور اہل شہر کے باقاعدہ علم میں ہوتیں تو اقبال کے حق میں بہتر ہوتا اصل میں اقبال نے اپنا کیس خود خراب کیا جو چھپ کر نماز پڑھتے رہے۔ شریعت کا تو معاملہ ہی ظاہر کا ہے!

ظاہری سُنّت کی پیروی کرنے والے ایک اور اعتراض بھی ان اعداد و شمار پر کر سکتے ہیں کہ فجر تو خیر فرض نماز ہے۔ تہجد کی نفل نماز اس اندازے میں کیوں شامل کی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فرمانِ الٰہی "ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک" کے تحت تہجد کا درجہ مقامِ محمود تک جاتا ہے مگر فرض فرض ہے اور نفل نفل۔ تاہم صاحبِ مقامِ محمود کے ساتھ اقبال کے عشق کا رنگ بھی دیدنی ہے کہ باحساب بھی ہے اور بے حساب بھی۔ ایک موقعے پر اقبال نے کہہ دیا کہ حساب کے بغیر تو اندازہ نہیں کتنا میں نے گن کر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کروڑ بار درود شریف پڑھا ہے![۴۳]

ظاہری سُنّت کے پابند اصحاب کو اقبال کی نمازوں کے یہ تخمینے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ مبنی بر ظن بلکہ حسنِ ظن ہیں اور سچ پوچھئے تو راقم کو یوں بھی عبادات

کی اس تفتیش پر بے حد پشیمانی ہو رہی ہے اور اس سارے عمل سے گھن آنے لگی ہے حالانکہ مسائلِ شرعی میں شرم وحیا کو کیا دخل ! ایک بات البتہ اس کراہت بھرے حساب کتاب سے ثابت ہے اور وہ یہ کہ سردار عبدالقیوم کے گمراہ معتبر گواہ جو اذان کو "مولوی کا بھونکنا" اور نماز کو "نماز شماز" کہتے ہیں ہرگز ہرگز اقبال کے "دوست" اور "رفیق" اور اقبال کی مجلس میں بیٹھنے والے اور اقبال پڑھنے والے نہیں ہو سکتے !

اقبال کا دروازہ تو سب بندگانِ خدا کے لیے کھلا تھا۔ مسلم غیر مسلم، اپنے پرائے، آشنا اجنبی، امیر غریب، چھوٹے بڑے، بھلے بُرے سب چلے آتے تھے ؎

در دل را بروئے کس نہ بستم
نہ از خویشان نہ از یاران گسستم
نشیمن ساختم در سینۂ خویش
نہ ایں چرخِ گرداں خوش نشستم
چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود !
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت واز کجا بود

(ارمغانِ حجاز)

"خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی"

ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بحث میں سردار عبدالقیوم نے جس پیرائے میں اقبال کے مولانا حسین احمد مدنی پر کہے ہوئے اشعار کی طرف اشارہ کیا اور جس طریقے سے وہ ایک کیسر بے تعلق موضوع کو بیچ میں لے آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اغلباً ان کو مولانا مدنی کی خاطر سے اقبال سے پُرانا بغض ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"میں نے کہا ڈاکٹر تو کہتا ہے آپ کا والد محترم کہ ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

"اگر اقبال کا اپنا کوئی شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے تو وہ بھی بولہبی ہے اس شعر کے مطابق۔ اس پر بھی عمل نہیں ہو سکتا": نارووے کے

سردار عبدالقیوم کی تقریر کے اس اقتباس کا ایک تاثر تو یہ ہے کہ اگر اقبال مولانا مدنی کی اس ایک رائے کی بنا پر کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ ان کی "تمام" زندگی اور خدمات کو "بولہبی" کہہ سکتے ہیں تو اقبال کے کسی خلاف رسولؐ شعر یا عمل پر اقبال کی "تمام" زندگی اور خدمات کو کیوں "بولہبی" نہ کہا جائے۔ دوسرا تاثر یہ ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ بحث میں اقبال کی ذات اور شخصیت کو غیر ضروری طور پر کھینچ لانے کے بعد سردار عبدالقیوم اقبال کی مولانا حسین احمد مدنی سے پچاس سال قبل کی بحث کو بالکل ہی غیر ضروری طور پر اس لیے درمیان میں لے آئے ہیں کہ مولانا مدنی کے خلفاء اور عقیدت مند سردار عبدالقیوم کی اقبال کے خلاف تحریک دشنام طرازی میں ان کی پیٹھ ٹھونکیں۔

اس نصف صدی پہلے کی بحث کے سلسلے میں بھی سردار عبدالقیوم کو واقعات وحقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ وطن کو قومیت کی بنیاد بنانے میں اقبال کو شروع ہی سے شدید اختلاف تھا۔ یہ ۱۹۰۸ء سے پہلے کا شعر ہے ؎

نرالا سارے جہان سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
(بانگِ درا)

اور یہ اشعار بھی کوئی زیادہ بعد کے نہیں ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِ ہاشمی
(بانگِ درا)

پھر فرمایا ؎

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
(رموزِ بے خودی)

اور فروری ۱۹۳۸ء میں فرمایا ؎

اگر قوم از وطن بودے محمدؐ
ندا دے دعوت دیں بولہب را
(باقیات اقبال)

اقبال پر ابتدا ہی سے منکشف تھا کہ فرنگی سیاست کے مقامروں نے وطنیت کے نظریے سے دنیائے اسلام کی بساط اُلٹ دی تھی اور وہ حضور سرور کائنات کے ایک نام لیوا کی حیثیت سے اس غیر اسلامی نظریے کے ریلے کے خلاف سینہ سپر ہو گئے کیونکہ برصغیر میں اسلام کی ایک بہت بڑی جمعیت کے نیست و نابود ہو جانے کا خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکیہ، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، یمن، افغانستان، ایران وغیرہ کا وطنیت کو اپنانا عالمگیر اسلامی اخوت کے تصور پر ضرب تو ضرور تھی لیکن وہاں کی مسلم جمعیتوں کے اسلامی تشخص اور اسلامی تمدن کے بقاء کا کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ ان علاقوں میں صدیوں سے غالب مسلم اکثریتیں آباد تھیں۔ برصغیر میں دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی آبادی چھ سات سو سال کی حکمرانی کے بعد انگریز اور ہندو کے گٹھ جوڑ سے ہمیشہ کے لیے غلامی اور ذلت کے گڑھے میں گرنے والی تھی اور برصغیر کے بعض دینی علماء اپنی سادہ لوحی، جذباتیت اور سیاسی ناپختگی کے طفیل مسلمان کو اس گڑھے میں دھکیل رہے تھے حالانکہ انہی علماء کو سب سے پہلے متحدہ قومیت کے اس مہلک عمل کے راستے میں سدِ سکندری بننا

چاہیئے تھا جس کے افسوس سے برصغیر کے ۲۵ فیصد مسلمان ابدالآباد تک ۷۵ فیصد ہندو کے غلام ہو کے رہ جاتے! ایک ہندوستان میں رہ کر مسلمان صرف ہندوستانی ہی کہلا سکتا تھا۔ اگر اسے الگ قومی اور ملّی تشخص مل سکتا تھا تو صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ گو کی حیثیت سے ایک الگ سیاسی چوکھٹے میں جس کا خاکہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں کھینچ دیا تھا لیکن کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء برصغیر کی سیاست میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حلقہ بگوشی کی بنا پر براہ راست تشخص کی اشد ضرورت کو نہ سمجھ سکے اور اسی لیے یہ علما اس تشخص کی دو عظیم برکتوں یعنی علیحدہ ملّت اور علیحدہ ملک کے تصور سے محروم رہ گئے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی تنبیہہ خلوص پر مبنی تھی۔ اس میں استعجاب کا رنگ اور وعید کا پہلو ضرور تھا مگر مولانا حسین احمد مدنی نے بھی تو یہ کہہ کر کہ قوم وطن سے ہے۔ اقبال کو بے پناہ کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۸ء کے چوتھے ہفتے سے لے کر مارچ کے تیسرے ہفتے تک یعنی پورے دو ماہ وہ سخت پریشان رہے۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ مولانا مدنی کو اپنی غلطی پر اصرار تھا اور بعد میں یہ نیا نظریہ مولانا نے قائم کر لیا کہ اسلام میں قوم اور ملت دو الگ الگ وجود ہیں۔ اقبال بے حد متاسف ہو کر فرماتے تھے۔ "مسلمان کیوں نہیں سمجھتے اسلام کی اجتماعی رُوح کیا ہے؟ وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے جو دین کے رمز شناس تھے"؟ اِن دنوں رات کو جب کبھی اقبال کی آنکھ کھلتی تو اکثر کہتے۔ "افسوس ہے، بڑا افسوس، مولانا حسین احمد نے یہ کیسے کہہ دیا۔ قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ شاید ہی کوئی مسلمان دین کے اجتماعی تقاضوں میں اتنی حساس طبیعت رکھتا ہو! ستمبر ۱۹۳۴ء میں اقبال نے سُنا کہ علی گڑھ میں "اینٹی گاڈ" یعنی "خدا دشمن" سوسائٹی قائم کی گئی ہے تو انہوں نے لکھا کہ "مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز میں گریہ و زاری کی کوئی حد نہ رہی"۔[۴۵] سوسائٹی توڑ دی گئی تھی اور اس کے منتظموں کو خارج کر دیا گیا تھا مگر یہ بات اقبال کے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ ایک اسلامی تعلیمی ادارے میں ایسی انجمن قائم ہو گئی تھی۔

اقبال نے مولانا مدنی سے اپنی بحث کے دوران یقین دلایا کہ "مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں"[۴۶] مولانا کے حامیوں نے اقبال کو پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں لیکن اقبال نے ان کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتے ہوئے کہا۔ "خدا تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے"۔ یوں یہ بحث اخبار "احسان" لاہور اور اخبار "انصاری" دہلی اور جناب طالوت کے درمیان سے گزرتی ہوئی مولانا مدنی کی تردید اور اقبال کے اعتراض کی مشروط واپسی پر منتج ہوئی جس کو بعض اصحاب نے غلط طور پر اقبال کی معذرت سے تعبیر کیا ہے اور اس ناروا حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "ارمغان حجاز" میں مولانا کے بارے میں کہے ہوئے تین فارسی اشعار کیوں شامل کیے گئے ہیں۔ حالانکہ اقبال کی وفات کے بعد خود مولانا مدنی نے اپنے کتابچے "متحدہ قومیت اور اسلام" میں اقبال پر طنز و تضحیک کے نشتر چلائے اور اپنے اسی موقف کو اسلامی حیثیت دینے کی کوشش کی جس کی انہوں نے اقبال کے ساتھ بحث کے دوران تردید کی تھی! چنانچہ ان اشعار کے حذف کا کوئی جواز نہیں تھا۔

یہاں اس امر کی تصریح ضروری ہے کہ اگرچہ اکثر علماء دیوبند مولانا حسین احمد مدنی کی طرح کانگرس کے ہمنوا اور متحدہ قومیت کے حامی رہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے اس موقف کی ڈٹ کر مخالفت کی اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے بالآخر اقبال کے سیاست میں تمسک بالدین یعنی ہندو سے علیحدگی کے نظریے کا ہی بول بالا ہوا۔ اس سلسلے میں ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے مشاہیر علماء اور مشائخ مثلاً مولانا شاہ مصطفےٰ رضا قادری مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی مفتی محمد برہان الحق، مولانا سید احمد سعید کاظمی پیر سید جماعت علی شاہ اور پیر صاحب مانکی شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کی تنظیم اور تحریک پاکستان میں عملی شرکت اور ذاتی معاونت عین وقت پر ملت کے کام آئی اور مسلم قومیت کا سیلاب مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے نیشنلسٹ رفقاء کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

سردار عبدالقیوم نے اس پرانی بحث کو یوں بالکل بے سبب بے محل چھیڑا۔ اس

کے مضمرات کچھ تو ہوں گے۔ آخر اقبال نے اپنی وفات کے پچاس برس بعد کون سا نیا شعر کہہ دیا جو سردار عبدالقیوم کے نزدیک خلافِ رسولؐ ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں۔ کیا سردار عبدالقیوم یہ نوٹس تو نہیں دے رہے کہ اب کلامِ اقبال کی چھان بین ہوگی اور اقبال کا جو شعر "خلافِ رسولؐ" ہوگا وہ "بولہبی" قرار دے دیا جائے گا یا کیا سردار عبدالقیوم مولانا حسین احمد مدنی کی ظاہری سُنّت کی پیروی اور عبادات کی پابندی کا تفوق حیات و خدمات اقبال پر ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ مولانا مدنی کے جانشین اور ارادت مند اس ملک میں اس نئے فتنے کو ہوا دے سکیں جو سردار عبدالقیوم نے شاتم اقبالؒ بن کر اٹھایا ہے۔

گالی کی تکنیک

سردار عبدالقیوم کی لمبی لمبی گفتگوئیں اِدھر اُدھر کی اَن مل بے جوڑ باتوں کے مکروہ جلاسے لگتی ہیں لیکن ذرا غور کیا جائے تو ان کی علامہ اقبال کے خلاف دشنام و الزام کی اس مہم میں ایک خاص تکنیک ہے جب بھی وہ طعن و تشنیع کا پتھر پھینکتے ہیں تو یہ احتیاط ضرور کر لیتے ہیں کہ وہ خود کسی اُونچے مچان پہ کھڑے ہوں تاکہ کوئی انہیں جوابی پتھر نہ مار سکے پہلے وہ اپنی مرضی کا کوئی اشتعال انگیز مفروضہ گھڑتے ہیں پھر وہ اس کا ٹانکا کسی مقدس حوالے کے ساتھ لگاتے ہیں اور پھر خوش گپی کے انداز میں کبھی لوبان سلگاتے ہیں کبھی گرد اُڑاتے ہیں کبھی دھواں چھوڑتے ہیں تاکہ مخالف کو پتہ نہ چلے کہ کیا ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ بس گالی یا الزام کا پتھر اس کے سر پہ لگے اور وہ مناظرے میں آجائے! مثلاً سردار عبدالقیوم ڈاکٹر جاوید اقبال پہ یورش کرنے سے پہلے کہتے ہیں۔

"اس تقریب میں شاعرِ مشرق مفکرِ اسلام علامہ اقبال مرحوم کے فرزند ارجمند

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ان کا سارا خاندان ہی آیا ہوا تھا۔ ان کی صاحبزادی بھی تھیں۔ ان کے داماد بھی تھے اور ان کی بہو بھی اور بیٹا بھی، سب کشمیری گھرانے ہیں سارے ہی سب کشمیری گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں. نارورے بڑ

یہاں تک تشبیب کا لوبان سُلگتا ہے تو سردار عبدالقیوم وہ پتھر چُن چکے ہوتے ہیں جو انہیں ڈاکٹر جاوید اقبال کے مارنا ہے۔ پھر گریز کا لمحہ آ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں :

"یہ نسبت کا بھی عجیب تماشا ہے اگرچہ خُدا نے نسبتیں رد کر دی ہیں۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں کہا کہ تمہاری کوئی نسبت نہیں ہے۔ " انه لیس من اهلک" اللہ نے کہہ دیا مگر وہ اللہ نے کہا میں تو نہیں کہہ سکتا تو اللہ تو کہہ سکتے ہیں وہ کہیں نہیں ہے تو نہیں ہے جب کہیں ہے تو ہے ان کو تو یہ قدرت ہے ہمیں تو نہیں ہے" نارورے بڑ

یہ کہتے کہتے سردار عبدالقیوم مسجد نبوی ؐ میں صفہ مبارک پر پہنچ جاتے ہیں اور بسطام کے سوڈانی کی نسبت سے اپنے ذکر کی اُلجھن کی کہانی سنانے لگتے ہیں یعنی اب گرد اُڑ رہی ہے اور دھواں پھیل رہا ہے۔

سردار عبدالقیوم ڈاکٹر جاوید اقبال کو ناخلف کہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں لیکن بڑا ہی زور لگا رہے ہیں کہ اس الزام کی ذمہ داری اللہ اُٹھا لے! ان سے پُوچھے تو کہیں گے۔ "میں بھلا انہیں ناخلف کیوں کہوں گا میں نے تو سارے گھرانے کا عزت سے ذکر کیا قرآن کی آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا پھر مسجد نبوی ؐ کے صفہ پاک پر اپنی قلبی واردات کا حال سُنایا۔" اب کہیئے اتنے اُونچے مچان پہ جوابی پتھر پھینک سکتا ہے کوئی ؟ ہے کسی میں جرأت ؟

کتنے ہی نامور سیاست دان اور دانشور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اسلام اور پاکستان کے بارے میں دن رات بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں اور رنگا رنگ راگ الاپتے رہتے ہیں۔ کیا سردار عبدالقیوم نے ان میں سے کسی کا یا کسی

کے "والد محترم" کا پتہ پُوچھا ؟

ہر شخص کو کسی اور شاعر یا ادیب یا مفکر کی طرح علامہ اقبال کی زندگی اور شاعری اور ان کے فکر و فلسفہ پر نقد و نظر کا حق ہے اور ظاہر ہے ہر شخص ان موضوعات کی تعبیر اپنے علم و استعداد اور فہم و ادراک کے مطابق ہی کرے گا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال علامہ اقبال کے صاحبزادے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب علم و فضل ہیں لیکن عین ممکن ہے اقبال سے متعلق کسی موضوع پر ان کی تعبیر یا رائے کسی دُوسرے قاری یا نقاد یا محقق کو قابل قبول نہ ہو۔ ناروے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے جو کچھ ویلفیئر سٹیٹ، یورپ کی تحریک احیائے علوم اور تحریک اصلاح، آئیڈیل سیکولر سٹیٹ کے پاکستان میں قیام، ربوٰ کے مسئلے، اپنے ماضی کی طرف لوٹنے یا اپنے مستقبل کی طرف بڑھنے اور اسلامائزیشن کے موضوعات پہ کہا (اقبال کے تعلق میں بھی اور اس سے علاوہ بھی) اس سے اختلاف کا پُورا حق سردار عبدالقیوم کو تھا لیکن وہ اس اختلاف کا اظہار وطن میں آکے کرتے تو بہتر ہوتا بہرحال اگر انہوں نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی قابل اعتراض باتوں کا ناروے ہی میں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تو بھی چاہیے تھا کہ پورے احساس ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ نکتہ بہ نکتہ برمحل جواب دیتے اور غیر ضروری اور غیر متعلق گفتگو سے احتراز کرتے لیکن ہُوا یہ کہ نہ صرف ناروے میں بلکہ یہاں آ کر لاہور اور راولپنڈی میں بھی جو ان کے منہ میں آیا وہ اُگلتے چلے گئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے تو انہوں نے جو لتے لئے سو لئے اب اصل صورت جو اس نزاع کی سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے سردار عبدالقیوم اقبال کے درپردہ دشمن تھے اور جانے کب سے ان کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی سرزنش کا موقعہ ملا تو انہوں نے علامہ اقبالؒ کے نام اور کام پر بھی زبان طعن دراز کی اور یُوں لگتا ہے کہ کوئی پُرانا حساب بغض و عناد کا چکا رہے ہیں۔

اقبال کے خلاف اس دشنام و الزام کی مہم میں سردار عبدالقیوم نے جس طرح اپنی مخصوص تکنیک سے کام لیا ہے وہ خاص انہی کا حصّہ ہے۔ یہاں ان کی تقریروں سے صرف مختصر اقتباس ہی دیئے جا سکتے ہیں۔ ان میں جا بجا سُلگتا ہُوا لوبان اور اُڑتی ہوئی

گرد اور پھیلتا ہوا دھؤاں سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ بس یہی دیکھیئے کہ کیسے کیسے اُونچے مچان بن رہے ہیں اور کیا کیا اشتعال انگیز مفروضے داغنے جا رہے ہیں۔

"علامہ الہامی شاعر ہیں ."۔۔ "اقبال کا کلام ایک طرح کا الہامی کلام ہے اور الہامی کلام ——— خود قرآن کہتا ہے۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ قرآن کی وجہ سے کئی لوگ گمراہ ہو گئے اور کئی ہدایت پر آ گئے"۔۔۔ "میں تو منع کرتا ہوں لوگوں کو کہ اقبال نہ پڑھیں اس لیے کہ اقبال پڑھنے والے میں نے اکثر گمراہ دیکھے ہیں"۔ نادرے ۲۱ / ۱

(یہاں سردار عبدالقیوم نے پہلے کچھ لوبان سلگایا ہے پھر قرآن مجید کی آیت کے حوالے سے اُونچا مچان بنایا ہے اور پھر یہ اشتعال انگیز مفروضہ قارئین اقبال کے سر دے مارا ہے کہ اکثر اقبال پڑھنے والے گمراہ ہیں)

"علامہ اقبال معصوم عن الخطا نہیں تھے نہ ہی ولی یا نبی تھے بلکہ وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک کئی مراحل سے گزرے"۔۔ "اقبال کو مافوق البشر کہنے والے ان کا مرتبہ گھٹا رہے ہیں کیونکہ سپاہی کو جرنیل کہنا اس کی بے عزتی کے مترادف ہے"۔ راولپنڈی ۱۹

(یہاں اشتعال انگیز مفروضے یہ ہیں کہ اقبال کے مداحوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو اقبال کو معصوم عن الخطا اور نبی اور ولی مانتے ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جو اقبال کو مافوق البشر کا مرتبہ دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ نہیں مانتے کہ اقبال بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزرے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو جانتے ہیں کہ اقبال صرف ایک سپاہی تھے لیکن وہ ان کی عزت بڑھانے کے لیے انہیں جرنیل کہتے ہیں اور یوں اقبال کی عزت گھٹاتے ہیں۔ اور اُونچے مچان یہاں دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی لیکن ہیں پس منظر میں یعنی عقیدۂ عصمت انبیاء اور عقیدۂ ختم رسالت اور عقیدۂ حفاظت اولیا۔ عقیدۂ بشریت بنی آدم اور عقیدۂ ارتقائے حیات طبیعی اور عقیدۂ فرق مراتب عسکری)۔

اس سے زیادہ اشتعال انگیز الزام ایک مسلمان کے خلاف نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ اقبال کو معصوم عن الخطاء اور نبی مانتا ہے۔ اقبال زندہ ہوتے اور انہیں کوئی معصوم

عن الخطاء اور نبی کہتا تو اگر وہ صدمے سے بے ہوش نہ ہو جاتے تو اس ظالم کو کم از کم شیطان کہتے اور اس پر لعنت بھیجتے! سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ ختم رسالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبالؒ کا شرح صدر فرما دیا تھا[۴۸]۔ اشتعال انگیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اقبال کے ہر مداح اور عقیدت مند کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ سردار عبدالقیوم سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ ان لوگوں کے نام کوائف اور پتے ایک فہرست کی شکل میں پریس کو ریلیز کر دیں جو ان کے علم میں اقبال کو معصوم عن الخطاء اور نبی مانتے ہیں۔ حقیقتِ حال ہر حال میں واضح ہونی چاہیے۔ اگر واقعی ایسے بدبخت لوگ اس ملک میں موجود ہیں جو اقبال کو معصوم عن الخطاء اور نبی مانتے ہیں تو یہ ایک فتنہ ہے اور اس فتنے کی سرکوبی حکومت اور قوم پر لازم ہے لیکن اگر ایسے کوئی لوگ یہاں نہیں ہیں تو سردار عبدالقیوم کو اس ناحق کی اشتعال انگیزی سے باز رکھنا بھی حکومت کا فرض اور قوم کا حق ہے۔

اب ذرا عقیدۂ حفاظت اولیاء کی طرف آیئے۔ قرآن سے ثابت ہے کہ لفظ ولی کا استعمال وسیع ہے۔ اللہ بندے کا ولی۔ بندہ اللہ کا ولی۔ بندہ بندے کا ولی۔ بندہ شیطان کا ولی۔ شیطان بندے کا ولی۔ شیطان شیطان کا ولی۔ ظاہر ہے یہاں سردار عبدالقیوم کی ولی سے مُراد وہ بندہ ہے جو اللہ کا ولی یا دوست ہے اور یہ امر غور طلب ہے کہ سردار عبدالقیوم مسلمان کے اس بنیادی عقیدے کے ساتھ کہ انبیاء معصوم تھے، اور حضور رسالتمآبؐ کے بعد کوئی نبی نہیں اپنا یہ مفروضہ دُوسروں پر نافذ کر رہے ہیں کہ اقبالؒ اللہ کے ولی نہ تھے۔ کوئی کسی کو ولی مانے یا نہ مانے یا کس کو ولی مانے اور کس کو نہ مانے؟ ممکن ہے آپ محسوس کریں کہ ایسے سوالوں کے جواب دینے کے آپ شرعاً مکلف نہیں ہیں لیکن اللہ کے ولی موجود ہیں۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

یعنی "یاد رکھو اللہ کے ولیوں کو نہ ڈر ہے اور نہ وہ غم کرتے ہیں"۔

یہ امر مسلم ہے کہ اگرچہ انبیاء کی زندگی بھی طبعی مراحل سے گزرتی ہے لیکن وہ ہر مرحلے پر خطا سے معصوم ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کی قبل بعثت زندگی کا عمل

بھی اس شریعت کے مطابق ہوتا ہے جو وہ اپنی بعد بعثت زندگی میں لاتے ہیں۔ اللہ نے جو معصومیت انبیاء کی فطرت میں رکھی ہوتی ہے وہ ان کی حیاتِ طبعی کے کسی مرحلے پر (خواہ وہ بچپن ہو یا جوانی یا بڑھاپا) مجروح نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اولیاءاللہ کی زندگی بھی گناہ سے محفوظ رہتی ہے اور خلافِ شریعت اعمال ان سے صادر نہیں ہوتے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اولیاء اللہ کے تذکروں میں بزرگوں کی توبہ کے واقعات و حالات بھی ملتے ہیں۔

جب سردار عبدالقیوم یہ کہتے ہیں کہ اقبال بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک کئی مراحل سے گزرے ہیں تو اغلباً وہ یہ سمجھا رہے ہیں کہ اگر اقبال کا بڑھاپا صالح تھا تو ضروری نہیں کہ ان کا بچپن اور جوانی بھی صالح گزری ہو۔ لگتا ہے کہ سردار عبدالقیوم اس جملے میں ان قصوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اقبال کے بعض ہندو دشمنوں نے اپنے مقاصد کے لیے گھڑے تھے اور جن کو اقبالؒ کے بعض مسلمان منافق دوستوں نے اپنے مقاصد کے لیے ہوا دی تھی، مگر جس انداز سے ڈاکٹر جاوید اقبالؒ نے "زندہ رود" میں اور شیخ اعجاز احمد نے "مظلوم اقبالؒ" میں ہر پہلو سے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا تار و پود بکھیرا ہے وہ انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے نہیں تحقیق حق کے بے لاگ مقاصد کے لیے کیا ہے۔ سردار عبدالقیوم اگر اقبال کے بچپن جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزرنے کا ذکر کرتے ہیں تو انہی بے بنیاد من گھڑت قصوں کو زندہ رکھنے کے لیے اور یہ ان کی اقبالؒ کے خلاف دشنام و الزام کی مہم کا سوقیانہ رُخ ہے۔ کتنے ہی اللہ کے بندے ہیں جو نہ نبی ہیں نہ ولی نہ معصوم عن الخطاء ہیں نہ مافوق البشر، مگر ان کا بچپن بھی صالح جوانی بھی صالح اور بڑھاپا بھی صالح گزرا ہے۔ یہ امکان کہ اقبالؒ کی پوری زندگی صالح تھی۔ سردار عبدالقیوم کے لیے کیوں اچنبھے کی بات ہے؟ آخر وہ اقبالؒ کو لوگوں کی نظروں میں گرانے کے لیے کیوں اتنی مشقت اُٹھا رہے ہیں؟ کیا ان کے بھی کوئی اپنے مقاصد ہیں؟

اقبالؒ اکثر اللہ سے دُعائیں التجائیں کرتے نظر آتے ہیں۔ دیکھیے وہ استدعا کر رہے ہیں ؎

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ لا یحزنوں کر!
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہیں!
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(بالِ جبریل)

خود اقبالؒ یہاں اس گروہ میں شرکت کی تمنا کر رہے ہیں جو خوف وحزن سے محفوظ ہے یعنی اللہ کے ولیوں کے ٹولے کے ساتھ ہونا چاہتے ہیں ۔

اور اللہ جسے چاہے اپنا ولی بنائے ہو سکتا ہے اس نے اقبالؒ کی دُعا قبول کر لی ہو اور انہیں اپنا ولی بنا لیا ہو۔ سردار عبدالقیوم نے کیسے فرض کر لیا کہ اقبالؒ ولی نہیں تھے کیا اللہ ان سے پُوچھ کر اپنے ولی بناتا ہے ؟

کسی کو مافوق البشر ماننے سے سردار عبدالقیوم کی مُراد اگر اس کو الوہیت میں شریک کرنا ہے تو یہ کھلا شرک ہے اور اس کا مرتکب اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا اس امر پہ بحث غیر ضروری ہے اور اگر مافوق البشر سے سردار عبدالقیوم کی مُراد بڑا آدمی، انسان برتر، مردِ کامل یا رجلِ عظیم ہے جیسے نطشے کا "ابرمنش (جسے برنارڈ شا "سپرمین" کہتا ہے) تو اس اصطلاح کا اقبالؒ پہ اطلاق کرنا کیوں کر غلط ہے ؟ سردار عبدالقیوم کو اقبالؒ میں کوئی بڑائی، برتری، کمال یا عظمت نظر نہیں آتی تو نہ آئے وہ دوسروں کی نظر پہ یہ قدغن کیسے لگا سکتے ہیں کہ وہ اقبالؒ میں کوئی بڑائی، برتری، کمال یا عظمت نہ دیکھے ؟ بینائی کی قوت بھی اپنی اپنی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ ہر آنکھ کو ہر شے دکھائی دے اور پھر بعض اوقات آنکھ تو ہوتی ہے اس میں بینائی نہیں ہوتی یا پھر آنکھ دیکھتی ہے مگر دل اندھا ہوتا ہے۔ اللہ سورۂ الحج میں فرماتا ہے۔

" فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور"۔

یعنی بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں بلکہ دل جو سینوں

ہیں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں؛

اور اقبالؒ بھی بصارت اور بصیرت کا قرآنی فرق واضح کرتے ہیں ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

("بانگِ درا")

دل بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

("بالِ جبریل)

سردار عبدالقیوم کا آخری مچان فوج کے رینک کا فرق اور لحاظ ہے - اس مچان سے انھوں نے یہ مفروضہ داغا ہے کہ اقبالؒ سپاہی ہیں اور سپاہی کی عزت اسی میں ہے کہ اسے سپاہی کہا جائے - اس لیے اقبالؒ کو جرنیل کہنے والے ان کی بے عزتی کر رہے ہیں -

ایک عام فہم و احساس کا آدمی سردار عبدالقیوم سے یہ پوچھے گا کہ یہ سپاہی اور جرنیل کے الفاظ کس میدانِ عمل سے متعلق ہیں کس معنی میں استعمال ہوتے ہیں - اقبالؒ کو کس نے جرنیل کہہ دیا جو سردار عبدالقیوم کو یہ کہنا پڑا کہ فوجی رینک کا تقدس ملحوظ رکھا جائے اور اقبالؒ کو صرف سپاہی کہا جائے - اقبالؒ تو کبھی فوج میں بھرتی نہ ہوئے تھے - اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں بعض فاتحین، غازیوں اور شہیدوں کا ذکر ضرور کیا ہے - مثلاً سکندرِ اعظم، چنگیز خان، نپولین، طارق، شکری پاشا، سلطان ٹیپوؒ شہید - ایک مقام پر البتہ اقبالؒ نے اپنے ریکروٹنگ افسر ہونے کا دعویٰ ضرور کیا ہے - فرماتے ہیں ؎

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

لیکن اس انکشاف سے اقبالؒ کا رینک معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو ایسی سروس

کرنے والے کا رینک صرف اللہ کے علم میں ہوتا ہے دوسرے ذاتی عزت و منفعت کا کوئی تصور اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ اس لیے کوئی سپاہی ہو تو کیا جرنیل ہو تو کیا ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

(بالِ جبریل)

قرآن مجید میں اللہ مومنوں سے کفار کے ساتھ جنگ میں فرشتوں کی کمک کا وعدہ فرماتا ہے۔ اقبالؒ اس وعدے کو ان لفظوں میں ڈھالتے ہیں ؎

تو مردِ میدان تو میرِ لشکر

نوری حضوری تیرے سپاہی

(بالِ جبریل)

اور یوں لگتا ہے اقبالؒ نے ملک و قوم کی آج کی حالت ہی کا نقشہ کھینچا تھا ؎

میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف

آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

(بالِ جبریل)

ظاہر ہے یہ سب کچھ ان لوگوں کے فہم سے بالا ہے جن کے سامنے انگریز کا چھوڑا ہوا فوجی نظام ہے جس میں رینک پر مبنی عزت و منفعت ہی جنگجوئی کے محرک ہیں اسی لیے عہدہ مقام اور مرتبہ سردار عبدالقیوم کے شعور پر مسلط ہے اور وہ ایک مبہم استعارے سے اقبالؒ کی تحقیر کر رہے ہیں جو ان کا مقصد وحید ہے۔

اقتدار کی عبرتناک قربان گاہ

اس بحث میں جو بات بار بار سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کو پاکستان کے تصور کے خالق اور ملی شاعر اور دینی مفکر کی حیثیت سے جو غیر معمولی اور منفرد مقام دیا جاتا ہے وہ سردار عبدالقیوم کے لیے ناقابلِ برداشت ہے اسی لیے وہ بے محل، لغو اور مضحکہ خیز، غلط، خلاف واقعہ اور اشتعال انگیز بیانات اور مفروضوں سے ایک فتنے کی

فضا پیدا کر رہے ہیں

یوں لگتا ہے جیسے عہدہ، مرتبہ یا مقام سردار عبدالقیوم کا نفسیاتی مسئلہ ہے حکومت آزاد جموں وکشمیر کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا عہدہ صدر کا ہے اور اپنے اس عہدۂ صدارت کا انہیں شدید اور بھرپور احساس رہتا ہے۔ کہتے ہیں۔

"میں اب تقریباً دو سال سے پریزیڈنٹ ہوں اور پریزیڈنٹ بھی میں کوئی کمزور پریزیڈنٹ نہیں ہوں آپ کو پتہ ہے جو لوگ مجھے جانتے ہیں ان کو پتہ ہے ٹھیک ٹھاک پریزیڈنٹ ہوں اللہ کے فضل وکرم سے . . . ." (ناروے ۲)

اقبال اکیڈیمی کو انہوں نے دھمکی تک دی ہے کہ اس کے معاملات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ وہ اقبال کے نام پر الحاد پھیلا کر پاکستان کی جڑوں اور نظریے کو نقصان پہنچا رہی ہے۔[۵۱]

یہاں تک تو بات مادی مرتبے کی ہوئی اب رُوحانی مرتبے کی طرف آیئے۔ سردار عبدالقیوم نے جا بجا تصوف سے اپنے شغف کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں خُدا نے انہیں ایسے صاحبانِ کرامت کی صحبت اُٹھانے کا موقعہ دیا ہے جن کی کرامت کی تصدیق سالک اور اولیاء اللہ بھی کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی خدمت میں بیٹھنے کی سعادت بھی انہیں ملی ہے جو اقبال کے مرتبے سے واقف تھے یا ان سے بڑا مرتبہ رکھتے تھے اِسی لیے ان کی نگاہ علامہ کی کسی کوتاہی یا غفلت پر نہیں رہی۔[۵۲]

عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح سردار عبدالقیوم نے اقبال کے گمراہ "دوستوں" اور "رفیقوں" اور اقبال کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور اقبال پڑھنے والوں کا اتا پتا بتائے بغیر اقبال کو ان کی گمراہی کا موجب قرار دیا ہے اسی طرح انہوں نے ان بزرگوں کی تعریف وعنوان کو بھی پردۂ اخفاء میں رکھا ہے جن سے ان کو اقبال کے مرتبے کا علم ہوا اور جو اقبال سے بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سردار عبدالقیوم صاحبان کرامت اور سالکین اور اولیاءاللہ کا ذکر کر رہے ہیں لیکن اقبالؒ کے مرتبے کی اُونچ نیچ یہاں بھی طے کر رہے ہیں۔ حال و مقام کی بات اقبالؒ بھی کرتے ہیں ؎

دِل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

(بالِ جبریل)

لیکن فرق صاف نظر آ رہا ہے اقبالؒ بتا رہے ہیں کہ بندے کو دیدۂ بینا چاہیے تو دل کو زندہ و بیدار رکھے اور سالک ہے تو راہِ حق میں بڑھتا ہی جائے ایک حال پر قانع ہو نہ ایک مقام پر! دوسری جانب سردار عبدالقیوم چند خاص سالکوں اور ولیوں اور بزرگوں کی بات کرتے ہیں تو ان کے مرتبے کی تصدیق اور تعیین کے سلسلے میں یعنی سردار عبدالقیوم کے لیے عہدے کی جو منفعت، عزت اور اہمیت "تن کی دُنیا" میں ہے وہی مرتبے کی "من کی دنیا" میں ہے۔ جب آدمی کی نفسیات پر عہدے، مرتبے اور مقام کا تعین یُوں حاوی ہو تو وہ تفتیش، تنقیص اور تفریق کے عمل سے کیونکر باز رہے؟

سردار عبدالقیوم کئی گمراہوں سے ملے اور ان کی گمراہی کا سبب انہوں نے اقبال اور کلامِ اقبالؒ کو قرار دیا لیکن انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ کون تھے۔ سردار عبدالقیوم نے کئی راہ دانوں کی صحبت اٹھائی جو اقبال کے مرتبہ شناس تھے یا اقبال سے بڑا مرتبہ رکھتے تھے لیکن انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ کون تھے۔ سردار عبدالقیوم نے بھٹکے ہوؤں کی گواہی بھی لے لی اور ہدایت یافتگان کی شہادت بھی تاکہ ان کا یہ قول معتبر ہو جائے کہ اقبال بداعمال تھے اور یُوں انہوں نے اللہ کے ایک مرحوم نیک نام بندے کو بدنام کرنے کی کوشش کی!

سردار عبدالقیوم کا زندگی میں نقطۂ نظر دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے ایک ممتحن کا نقطۂ نظر ہے جو امتحان کے ذریعے دوسروں کا علم و استعداد جانچتا ہے انہیں پاس فیل کرتا ہے اور ڈویژن اور گریڈ دیتا ہے یعنی ان کے درجے اور مرتبے متعین کرتا ہے۔

دیکھیئے سردار عبدالقیوم اپنے سامعین کا کس طرح امتحان لیتے ہیں۔ ایک جلسے میں ایک صاحب نے اقبالؒ کا کلام پڑھا جس میں یہ شعر بھی تھا ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اِس جلسے میں ڈاکٹر جاوید اقبال بھی موجود تھے۔ سردار عبدالقیوم نے اس شعر کے بارے میں حاضرین سے کہا۔

"میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو چھوڑ کے معذرت سے آپ میں سے کوئی آدمی اس شعر کی گرد بھی بیان نہیں کرسکتا کہ اس کا مفہوم کیا ہے ہم ایک نہیں اگر ایک ہزار کتابیں تصوف پر پڑھیں ایک ہزار کتابیں پڑھی ہوں تصوف پر کسی آدمی نے تو وہ شاید کچھ نہ کچھ اس کے معنی بیان کر سکے" (ناروے ۱)

سردار عبدالقیوم نے اس سے اگلی تقریر جس جلسے میں کی اس میں ڈاکٹر جاوید اقبال موجود نہ تھے۔ انھوں نے پہلے جلسے کی طرف اشارہ کر کے پھر اس شعر کا ذکر کیا۔

"وہاں کچھ لوگوں نے اقبالؒ کے شعر پڑھے۔ میں نے کہا کہ آپ ان شعروں کے معنی سمجھتے ہیں۔ جاوید کا تو میں نے لحاظ کیا مجھے پتہ تھا کہ اس کو بھی معنی نہیں آتے۔ لیکن میں نے لحاظ کیا۔ میں نے کہا یہ تو بیٹے ہیں ان کے۔ شاید ان کو کچھ آتا ہو لیکن تم بتا سکتے ہو اقبالؒ کیا کہتا ہے۔

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

میں نے کہا کہ ایک ہزار کتاب تصوف پر کسی نے پڑھی ہو تب اقبال کے شعر کے معنی سمجھ سکتا ہے۔ نہیں سمجھ سکتا کہ کیا کہا اقبالؒ نے۔ (ناروے ۲)

ان اقتباسات سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں صرف سردار عبدالقیوم ہی اقبالؒ کے اس شعر کے معنی سمجھتے تھے کیونکہ جو خود ایک شے کا علم رکھتا ہو وہی دوسروں سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کا علم نہیں رکھتے۔ دُوسرے یہ کہ سردار عبدالقیوم ایسے ممتحن ہیں جو اُمیدوار کو اپنی قابلیت کے اظہار کا موقعہ دیئے بغیر اپنی مرضی کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ڈاکٹر جاوید اقبالؒ یا حاضرین میں سے کسی اور صاحب سے کہتے کہ اس شعر کے معنی بیان کریں تو وہ کر ہی دیتے۔ مجمعے میں موجود لوگوں کو اچھی طرح جانے بغیر ان کے ساتھ ملے بیٹھے یا علمی ادبی گفتگو کئے بغیر ان کے بارے میں ان کے سامنے یا پس پشت برسرِعام اس طرح کی رائے دے دینا اپنی ہمدانی اور دُوسروں کی ہیچ مدانی کا ناشائستہ اشتہار ہے اور نرا تکبر ہے! یہ طرزِ عمل علم اور اخلاق کے کس تقاضے کو پورا کرتا ہے؟ شرافت اور دیانت کے کس معیار کے موافق ہے؟ احتیاط اور تقوے کے کس اصُول کے مطابق ہے؟ ممکن ہے "قرآن وسُنت سے واقفیت رکھنے والے" سردار عبدالقیوم کے حامی "اہلِ علم" اور ان "صاحبانِ کرامت" کو جن کی صحبت سردار عبدالقیوم نے اٹھائی ہے۔ ان سیدھے سادے سوالوں کا جواب دینا گوارا ہو۔

دُوسروں کے فہم و فراست کی بے جواز توہین کوئی اچھی بات نہیں اسی طرح یہ بات بھی اچھی نہیں کہ سردار عبدالقیوم نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی موجودگی میں تو یہ ظاہر کیا کہ ان کو اس شعر کے معنی آتے ہیں مگر بعد کے جلسے میں جہاں وہ موجود نہیں تھے۔ انہوں نے حاضرین سے یہ کہا کہ وہ تو انہوں نے ڈاکٹر جاوید اقبالؒ کا لحاظ کیا تھا ورنہ انہیں پتہ تھا کہ ان کو بھی اس شعر کے معنی نہیں آتے یعنی آدمی کے مُنہ پہ ایک بات اس کی پیٹھ پیچھے اس کے اُلٹ بات اور دونوں باتیں سٹیج پر سے بھرے جلسے میں! ظاہری سُنّت کی پیروی اور نماز روزے کی پابندی کے دعوے بھی ہوں اور لوگوں کی سمجھ بوجھ کا یوں کھُلم کھُلا مُنہ بھی چڑایا جائے۔ اس کے لیے بڑی ہی بے باکی کی ضرورت ہے اور یہ بے باکی سردار عبدالقیوم نے اپنے راج سنگھاسن کی مادی اور روحانی فتوحات سے پائی ہے۔

کون پوچھ سکتا ہے کہ کل وہاں
کیا کہا تھا اور آج یہاں کیا کہہ رہے ہیں ؟ اقبالؒ پر بداعمالی کا الزام اس بے باکی کی سنگین ترین مثال ہے۔

سردار عبدالقیوم نے ناروے میں اپنی ایک تقریر میں علامہ اقبال کے عشقِ رسولؐ کے بارے میں کہا۔

"اس عشق کے باوجود اقبال ظاہری طور پر، باطن کا معاملہ اللہ کو پتہ ہے، سنتِ رسول اللہ کے پابند نہیں تھے ..... وہ ظاہری سُنّت کی پیروی نہ کرنا نماز باقاعدگی سے نہ پڑھنا اور جو دوسرے لوازمات ہیں ان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر کے کلام میں ہدایت کا اثر ہی سلب کر دیا ... اور ڈاکٹر کو اس پر ندامت تھی ... ڈاکٹر اس پر روتا تھا پریشان ہوتا تھا اور ڈاکٹر نے کہا کیا ذرا نہیں ایک اور رُباعی ہے جو چھوڑ دی تھی انہوں نے میں اس کو نہیں دُہراتا لیکن ایک خاص بات انہوں نے کہی اپنی اس بداعمالی اور ندامت کی وجہ سے ..." (ناروے ۲)

اور پھر سردار عبدالقیوم نہ صرف اس رُباعی کو دُہراتے ہیں بلکہ اس کی تشریح بھی کرتے ہیں اور پھر یہ خبر دیتے ہیں۔

"ڈاکٹر کو چونکہ اس پر بہت ندامت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ یقیناً اس ندامت کی وجہ سے اس کو معاف کر دیں گے"۔ (ناروے ۲)

ان اقتباسات کے پیشِ نظر کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ سردار عبدالقیوم نے اقبالؒ کی ذات کو بحث کا موضوع بنایا۔ قارئین کرام توجہ فرمائیں کہ باوجود یہ کہنے کے کہ وہ اس رباعی کو نہیں دُہرائیں گے۔ انہوں نے اسے دُہرایا (یہ وہی رُباعی ہے جس کا ذکر ڈیرہ غازی خان کے ماسٹر محمد رمضان کے حوالے سے پہلے کیا جا چکا ہے)

وہ تو ڈاکٹر جاوید اقبالؒ کی سرزنش کے بہانے ناروے میں ہوا۔ لاہور کے "جنگ فورم" میں جب سردار عبدالقیوم "صلح" کے لیے آئے تو انہوں نے ایک بار اور اقبالؒ کے "دوستوں" "رفیقوں" اقبالؒ کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور اقبالؒ پڑھنے والوں کا

ذکر کیا اور پھر اقبال کی ذات کو زیر بحث لائے۔

"میں نے ان سب کو گمراہ دیکھا ہے وہ نہ تو نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں، اور اس کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم تو اپنے مرشد کے راستے پر چل رہے ہیں۔ اقبال کو اپنا مرشد کہتے ہیں اور ترک نماز روزہ کا جواز اس میں مہیا کرتے ہیں"۔ (لاہور ۳)

اس کے بعد اقبالؒ کے خلاف اپنے ہی عائد کردہ بداعمالی کے الزام کی وضاحت کرتے ہوئے سردار عبدالقیوم نے کہا۔

"آپ وڈیو میں دیکھیں گے کہ میں نے بداعمالی کا لفظ ایک سیکنڈ کے لیے روک کر استعمال کیا ہے۔ وہ اس لیے کہ میرے ذہن میں اس کے چار متبادل لفظ آئے تھے، بے عملی، کوتاہی، غفلت، لغزش۔ آپ یہ دیکھیں کہ یہ ذکر میں سُنّتِ رسولؐ کے حوالے سے کر رہا ہوں، کسی اور تناظر میں نہیں کر رہا۔ اقبال کے احترام کا تقاضا یہ تھا کہ میں ان الفاظ میں سے کوئی لفظ کہتا لیکن یہ بات کہنے سے سُنّتِ رسولؐ کی عظمت اقبالؒ کے مقابلے میں کم ہوتی تھی۔ میں اس اُلجھن میں پھنس گیا۔ ایک لمحے میں مجھ پہ یہ کیفیت وارد ہوئی اور اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ سُنّتِ رسولؐ کے مقابلے میں نہ اقبال کوئی شے ہیں نہ اور کوئی شے ہے یہ میرے اعتقاد کا مسئلہ ہے اس میں کوئی بناوٹ نہیں ہے"۔ (لاہور ۳)

سردار عبدالقیوم نے کہیں پہلے چند گمراہ لوگوں کو دیکھا تھا اور انہیں اقبالؒ کو اپنا مرشد کہتے ہوئے سُنا تھا۔ انہوں نے یہ نہ سوچا تھا کہ ان کی اس گمراہی میں اقبال کی ذمہ داری کیونکر تھی یا کیا اقبالؒ نے کبھی کسی کو مرید بنایا بھی؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے سردار عبدالقیوم نے ان گمراہوں کو معتبر جانا تھا مگر عجیب تر بات یہ ہے کہ ان کی گواہی انہیں ناروے میں یاد آئی تو اقبال کے لیے چالیس سالہ پُرانا احترام دفعتاً ان کے دل سے مِٹ گیا اور اب انہوں نے اقبالؒ کو سُنّتِ رسولؐ کے تقابل اور تناظر میں پایا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک کیفیت سردار عبدالقیوم پر وارد ہوئی اور اس نے ایک ہی جھپٹے میں بے عملی کوتاہی، غفلت اور لغزش کے الفاظ پلٹ دیئے اور بداعمالی کا لفظ ان کی زبان پر رکھ دیا۔ سردار عبدالقیوم کا خیال ہے کہ یہ کیفیت سنتِ رسولؐ کی عظمت نے پیدا کی تھی کیونکہ

سُنّتِ رسُولؐ ان کی کمزوری ہے اور جب وہ سُنّتِ رسُولؐ کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو وہ اقبالؒ یا کسی اور کو معاف نہیں کر سکتے مگر عین ممکن ہے کہ سردار عبدالقیوم اپنی انا کی ترنگ کو کیفیت کا عارفانہ رنگ دے رہے ہوں اور سنّتِ رسُولؐ کی عظمت کے نام پر ایک اُدنچا مچان بنا رہے ہوں تاکہ بداعمالی کی اس اشتعال انگیز گالی کا جواز پیش کر سکیں جو وہ اقبال پر ناروے میں داغ آئے تھے۔

اِس توجیہہ کے بعد کہ اقبالؒ کے لیے بداعمالی کا لفظ انہوں نے ایک ارفع قلبی کیفیت کے دوران استعمال کیا وہ اس کے معانی کی وضاحت کرتے ہیں۔

"بداعمالی ہمارے نزدیک چوری، ڈاکہ، زنا، شراب، جوا وغیرہ ہیں لیکن جو خدا اور اس کے رسُول سے محبت کرنے والے ہیں ان کے نزدیک بداعمالی کا معیار کچھ اور ہے ان کے ہاں یہ باتیں شمار ہی نہیں ہیں، ان کے نزدیک کوئی کوتاہی ہو گئی۔ درُود شریف جتنا پڑھنا تھا نہیں پڑھا تو یہ بھی بداعمالی ہے وہ اس پہ بھی اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال نے رسُولؐ سے جس عشق کا اظہار کیا ہے اور جو انہیں حضورؐ کی ذات سے تھا وہ سُنّتِ رسُول کے زمرے میں آتا ہے سُنّتِ رسُول صرف داڑھی رکھنے میں نہیں ہے۔" (لاہور ۳)

یہاں سردار عبدالقیوم صاف تو نہیں کہتے تاثر سا دیتے ہیں کہ انہوں نے اقبال کے لیے جو بداعمالی کا لفظ استعمال کیا وہ "چوری"، "ڈاکہ" وغیرہ کے معنی میں نہیں کیا جس طرح عوام کرتے ہیں بلکہ اوراد و وظائف میں کوتاہی کے معنی میں کیا ہے جس طرح خواص کرتے ہیں۔ سردار عبدالقیوم سے صرف یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جس جلسے میں انہوں نے اقبال کے لیے بد اعمالی کا لفظ استعمال کیا۔ اس میں عوام موجود تھے یا خواص اور انہوں نے بداعمالی کے معنی کی یہی تصریح وہاں اس وقت کیوں نہ کی؟

"جنگ فورم" کی نشست کے خاتمے پر سردار عبدالقیوم نے کہا:

"میں علامہ اقبال کی ذات کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا .. میں "جنگ" سے دو

بایں کہنا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ کی ذات کو موضوع بحث نہ بنایا جائے۔
البتہ ڈاکٹر جاوید اقبالؒ کی سوچ ضرور موضوع بحث بنے گی کہ وہ مخصوص
سوچ رکھتے ہیں اور کچھ لوگوں کو اس سوچ سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے"۔ (لاہور ۲)

ناروے میں ڈاکٹر جاوید اقبالؒ کی تقریروں سے سردار عبدالقیوم کے لیے جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس میں ان کو اپنے اختلافی خیالات کے اظہار کا پورا حق تھا اور ان کی اپنی تقریروں سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے اس حق کے استعمال میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر یہ بات بے حد تعجب انگیز ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے خلاف جوشِ معاندت میں وہ بالکل بے جواز علامہ اقبالؒ کی ذات کو کھینچ لائے اور ان پر بداعمالی کا الزام لگایا۔ اس سلسلے میں کسی احتیاط کا تو کیا ذکر انہوں نے تاویلوں کے پینترے بدل بدل کر دلیلوں کے داؤ گھما گھما کر اقبالؒ کی ذات پر حملے کئے۔ لاہور آئے تو اس دشنام دالزام کی نئی نئی توجیہات کرتے ہوئے پھر اقبالؒ کی ذات کو زیر بحث لائے لیکن کہا یہ کہ "میں علامہ اقبالؒ کی ذات کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا" اور پھر چلتے وقت یہ وصیت کی کہ "علامہ اقبالؒ کی ذات کو موضوع بحث نہ بنایا جائے"۔

اس کے بعد راولپنڈی میں "میٹ دی پریس" پروگرام میں سردار عبدالقیوم پھر اقبالؒ کی ذات کو زیر بحث لائے اور اپنے گھڑے ہوئے مفروضوں کی بناء پر انہوں نے پھر اشتعال انگیزی کی اور کہا۔ "علامہ اقبالؒ مرحوم معصوم عن الخطاء نہیں تھے نہ ہی ولی یا نبی تھے بلکہ وہ بچپن جوانی اور بڑھاپے تک کئی مراحل سے گزرے ..." انہوں نے اصرار کیا کہ ناروے میں اقبالؒ کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ درست تھا اور انہیں اس پر کوئی ندامت نہیں اور لاہور میں کہی ہوئی بات یوں دہرائی۔

"اگر میں ناروے میں علامہ اقبال کے لیے نرم لفظ استعمال کرتا تو سنتِ رسولؐ کی عظمت کم ہو جاتی اور اس طرح میرا ایمان سلب ہو جاتا تو میں اقبالؒ کی عظمت کا کیا کرتا"۔ (لاہور ۳)

راولپنڈی کے اسی پروگرام میں سردار عبدالقیوم نے بدعملی کے مفہوم کو

اور آگے بڑھانے کے لیے کہا "مسلسل ترک خیر بدعملی میں شامل ہے" اور وہیں اقبالؒ کی حیات و فکر و نظر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر اجمالاً یوں پیش کیا۔

"علامہ اقبالؒ کی جامع شخصیت تھی مگر ان کی شخصیت، بصیرت اور متصوفانہ خیالات کے بارے میں بھی منفی خیالات ہو سکتے ہیں۔" (راولپنڈی ۸۴)

غور فرمایئے پہلے ناروے میں خود اقبال کی ذات پر بحث کرنا پھر لاہور میں اسی بحث کی روئیداد سُنانا اور اسے پھیلانا پھر کہنا اقبالؒ کی ذات کو زیر بحث نہ لایا جائے۔ پھر راولپنڈی میں نہ صرف اقبال کی ذات کو زیر بحث لانا بلکہ اس بحث کو اور کئی گوشوں میں آگے بڑھانا اور پھر یہ الزام عام عائد کرنا کہ جو لوگ اقبال کی مدافعت کر رہے ہیں وہ اقبال کے نام پر الحاد پھیلا کر پاکستان اور اس کے نظریے کو نقصان پہنچا رہے ہیں!

اب سردار عبدالقیوم دروغ گو تو ہیں نہیں کہ آدمی یہ کہہ دے کہ ان کے حافظہ نہیں۔ ناروے میں جو کیا وہ لاہور میں یاد نہ رہا اور لاہور میں جو کہا وہ راولپنڈی میں یاد نہ رہا۔ وہ تو صرف بے باک ہیں اور بے حد بیباک ہیں۔ ان کو ان کی ظاہری سُنت کی پیروی اور نماز روزے کی پابندی نے جو بے پناہ اعتماد دیا ہے۔ وہ آج تک شاید ہی کسی باریش باقاعدہ نمازی اور روزے دار مسلمان کو نصیب ہوا ہو۔ یہ اعتماد اس معنی میں بے پناہ ہے کہ جو گالی یا الزام وہ (ان کے اپنے خیال میں) کسی ظاہری سُنت کی پیروی اور نماز روزے کی پابندی نہ کرنے والے کو دے دیں اس سے کوئی پناہ اس بیچارے کے لیے نہ ہوگی!

ان گزارشات کی ابتدا میں مولانا عبدالستار خاں نیازی کے حوالے سے یہ کہا گیا تھا کہ سردار عبدالقیوم کے ساتھ کسی امر پر بحث کرنا ممکن نہیں کیونکہ وہ کسی ایک موقف پر قائم نہیں رہتے۔ وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ اپنے بیانات بدلتے رہتے ہیں لیکن اس بحث سے اب تک یہ واضح ہو چکا ہے کہ ان سے علامہ اقبال کے بارے میں کسی بحث کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ سردار عبدالقیوم نے بہت طویل زمانے سے اپنے سینے میں اقبال کے خلاف بغض پال رکھا ہے اور اس بغض کو انہوں نے اپنے ایمان کی شرط بنا لیا ہے۔ سُنت ظاہری کی پابندی کرنے والے ضرور متعجب ہوں گے کہ ایمان مفصل کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی۔

"مانے اللہ کو اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو اور آخرت کے دن کو اور تقدیر اچھی اور بُری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور موت کے بعد اُٹھنے کو"۔

اور ایمان مجمل کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی

"مانے اللہ کو جیسا کہ وہ ہے اپنے ناموں اور صفتوں کے ساتھ اور قبول کرے اس کے سارے حکموں کو زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق کے ساتھ"

لیکن سردار عبدالقیوم کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ

"مانیں کہ نہیں تھا اقبال کوئی نبی یا ولی، نہیں تھا وہ معصوم عن الخطاء اور نہیں تھا۔ وہ مافوق البشر اور یہ کہ ہٹا ہٹڑا تھا وہ سُنّتِ رسُول کے رستے سے اور تھا مسلسل تارک خیر اور یہ کہ گالی دینا ہے اس کو بدعملی کی دل کی دشمنی اور زبان کی درازی کے ساتھ"

یہی مطلب ہے ان کے اس قول کا کہ اگر وہ اقبال کو بدعملی کا مرتکب نہ کہتے تو ان کا ایمان سلب ہو جاتا۔ ایک عام مسلمان تو یہی سمجھے گا کہ ایسا ایمان نہ ایمان مفصّل کی تعریف سے مشتق ہے نہ ایمان مجمل کی تعریف سے یہ تو صرف ایمان مہمل ہے کیونکہ یہ بے سند ہے اور اس کا رُخ خالقِ کائنات یعنی اللہ کی اطاعت کی جانب نہیں بلکہ ایک اِنسان کی عداوت کی طرف ہے!

سردار عبدالقیوم یہ کھُلا تاثر دیتے ہیں کہ ان کی ذات حسنات شریعت اور حسنات طریقت کا مجمع البحرین ہے۔ ان کی ظاہری سُنّت کی پیروی اور نماز روزے کی پابندی کا ڈنکا تو ان کی تقریروں اور گفتگوؤں میں برابر سُنائی دے رہا ہے۔ اگرچہ وہ کہیں پیش منظر میں بجتا ہے کہیں پس منظر میں۔ کتابی علم میں سردار عبدالقیوم کا زعم ہزاروں میں کھیلتا ہے۔ اقبال کے اس شعر کو یاد کیجیے جس کے معنی نہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو آتے تھے نہ جلسے کے حاضرین میں سے کسی اور کو کیونکہ اگر کسی نے ایک ہزار کتاب تصوف پر پڑھی ہوتی تو وہ شاید

کچھ نہ کچھ معنی اس کے بیان کر سکتا اور چونکہ اتنی کتابیں وہاں صرف سردار عبدالقیوم نے پڑھ رکھی تھیں اس لیے صرف وہی اس کے معنی جانتے تھے مگر بطور ممتحن انہوں نے اپنی شان قائم رکھی اور اس شعر کے معنی بتانا مناسب نہ سمجھا۔

اِس سے پہلے سردار عبدالقیوم کی رُوحانی کیفیتوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک کیفیت تو وہ تھی جو انہوں نے نسبت کے حوالے سے اس وقت محسوس کی جب مسجد نبوی ؐ میں صفہ پاک پر شیخ طیفور بن بایزید کے ایک فرزند نے سردار عبدالقیوم کی توجہ اور ذکر کو اپنی کمر میں جذب کر لیا اور وہ اس کے جدِ امجد کے تصور میں کھو گئے۔ دوسری کیفیت وہ تھی جو ان پر تارے میں وارد ہوئی۔ وہ اس لمحے اپنی تقریر کے دوران اس اُلجھن میں تھے کہ اقبال کو بے عمل کہیں یا بدعمل کہیں اور پھر اس کیفیت کے زیر اثر انہوں نے اقبالؒ کو بدعمل کہہ کر نہ صرف اپنے ایمان کو سلب ہونے سے بچا لیا بلکہ لوائے سنتِ رسولؐ کو بھی اُونچا کر دیا۔ یعنی سردار عبدالقیوم کہہ رہے ہیں کہ میرے ایمان کا وجود اور سُنّتِ رسُولؐ کی عظمت دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ میں اقبالؒ کو چھوٹی گالی دوں یا بڑی گالی دُوں! اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ایسی شریعت! ایسی طریقت! نہ کتاب و سُنّت کی خیر! نہ سلوک و معرفت پہ نظر!

شیخ احمد نامقی جامی نے خواجہ مودود چشتی سے فرمایا تھا۔

"برو و علم آموز کہ زاہد بے علم مسخرۂ شیطان است"! [۵۳]

اور شیخ مجدد احمد سرہندی نے اپنے اس مرید سے جو اپنی کیفیتیں انہیں سُنانے لگ گیا تھا فرمایا تھا۔

"سبق بخواں کہ صوفیٔ جاہل مسخرۂ شیطان است"۔ [۵۴]

ایسے معاملات میں راقم کچھ کہنے کا اہل نہیں ہے لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سردار عبدالقیوم کی ان دونوں کیفیتوں سے کسی حوصلہ افزا روحانی صلاحیت کی خبر نہیں ملتی۔ پہلی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سردار عبدالقیوم کا اپنا وظیفہ بھی ان کے اپنے بس میں نہیں اور وہ اسے ٹھکانے پر نہیں پہنچا سکتے اور دوسری کیفیت سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ان کا دل سلامتی کی پٹڑی سے اُتر چکا ہے اور فہم و احساس کی کجی نے ان کے تصورِ ایمان و سُنّتِ رسُولؐ کو مسخ کر رکھا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ایمان کی حفاظت کو ایک مرحوم مُسلمان کی مذمّت پر منحصر کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے سُنّتِ رسُولؐ کو الزام و دشنام کے فعل شنیع کے ساتھ وابستہ کرنے کی جسارت بھی کر دی ہے۔ حالانکہ جس طرح اللہ اپنی ذات میں اکبر ہے اور اس کی کبریائی انسان کی حمد و ثنا پر منحصر نہیں اسی طرح حضور ختم المرسلین کی سُنّتِ پاک اپنی ذات میں اعظم ہے۔ کسی مسلمان کا عظیم سے عظیم عمل سُنّتِ رسُولؐ کی عظمت میں ذرّہ بھر اضافہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں کوئی اضافہ ممکن ہی نہیں!

مُسلمان کے لیے اگر سنتِ رسُولؐ کا اتباع لازم ہے تو صرف اور صرف اس کی اپنی سلامتی اور فلاح کی خاطر ہے کیونکہ اس کے لیے دنیا اور آخرت کی ساری حسنات اور ایمان و احسان کی ساری منزلیں فقط در پئے مصطفےٰ ہیں لیکن کوئی مسلمان اگر یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اپنے کسی عمل سے سُنّتِ رسُولؐ کی عظمت بڑھا رہا ہے تو وہ جان لے کہ وہ عین گمراہی میں ہے اور اگر اس کا وہ عمل بھی مستحسن نہیں تو یہ سُنّتِ رسُولؐ کی برملا توہین ہے اور اللہ نہ کرے اس کے سارے عملوں کی گٹھڑی جس کو وہ اب شیخی میں جگہ جگہ اُچھالتا پھرتا ہے۔ آنے والی کٹھن گھڑی میں کہیں ڈھونڈے سے ہاتھ نہ آئے گی! ایسے مقامِ ادب پر ایسا گستاخانہ دعویٰ کھُلی بربادی ہے۔ اللہ سورہ حجرات میں فرماتا ہے:

اے ایمان والو تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اُونچی نہ کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو ——— جیسے ایک دُوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

جہاں اُونچی آواز سے، عام بول چال کے انداز سے سارا خانۂ اعمال خراب ہو جاتا ہو، وہاں سُنّتِ رسُولؐ کی توقیر بڑھانے کے زعم میں الزام تراشی سے کیا کیا قہر نہ ٹوٹے گا!

لگتا ہے کہ سردار عبدالقیوم کی اپنی ہمہ دانی اور دُوسروں کی ہیچمدانی کی تشہیر، اپنی نیک عملی اور دُوسروں کی بدعملی کا اعلان، بار بار کا قول و فعل کا کھلا تضاد، ظاہری عبادات

کے چرچے اور باطنی کیفیات کے دعوے، سب کے سب اس بے باکی کے کرشمے ہیں جو تکبر کی خاص دین ہے اور یہ تکبر ان کے عہدۂ صدارت کے ساتھ مختص ہے۔ ظاہر ہے ان کے منصب نے ان کے مامور من اللہ ہونے کے احساس کو تقویت دی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکومت عطا کی ہے اس لیے وہ نماز اور زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنے کے مکلف ہیں۔ کہتے ہیں۔

"سارے ملک میں ایک نظام نافذ کرنا ہے اور میری اوّلین ذمہ داری پروردگار عالم نے یہ لگائی ہے"۔ (ناروے ۱۳)

سردار عبدالقیوم کا خیال ہے کہ لوگ ان کی "عزت کرتے ہیں" ان کی "بات سنتے ہیں" ان کا "احترام کرتے ہیں" لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے دو سالوں میں اپنے سٹاف کے "چالیس پچاس ساٹھ" لوگوں کو نمازی نہیں بنا سکے اور انہیں "چھ مہینے بعد" پتہ چلا کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں "جن کو نماز کا سبق ہی نہیں آتا سرے سے"۔ یہ صورت حال اُمید افزا نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی۔ لوگ اپنا فکر و عمل ان حاکموں کے کہنے سے نہیں بدلتے جن کی وہ صرف عزت کرتے ہیں البتہ وہ ان رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کے لیے ان کے دلوں میں عزت سے زیادہ محبت کے جذبات موجزن ہوں کیونکہ صرف محبت ہی انسان کو ایثار کے اس اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچاتی ہے جہاں وہ محیر العقول کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ اس مملکت خداداد پاکستان کی بنیاد اس بے پناہ محبت سے اُٹھی ہے جو اسلامیان برصغیر کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی ذات سے تھی وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے مگر وہ ان کو جی جان سے چاہتے بھی تھے۔ اقبالؒ کا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام ان کے دلوں میں اُتر گیا تھا اور قائداعظمؒ کی آواز پر وہ اپنا سب کچھ فدا کرنے پر تیار تھے۔ ان دونوں کا نام اور کام ان دونوں کی زندگیاں تقریباً چالیس برس سے کروڑوں مسلمانوں کے سامنے تھیں وہ جانتے تھے کہ اللہ کے یہ دو بندے کھرے اور سچے اور پکے تھے۔ ایک کی بصیرت نے مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ایک اسلامی مملکت کا نقشہ ان کے منقدر میں دیکھا اور محمد علی جناح کی ذات میں وہ رہنما پہچانا جو ان کو

برصغیر میں آنے والے طوفان سے بچا سکتا تھا۔ دوسرا اپنی لاثانی قوتِ عمل سے اس نقشے کو تخیل سے حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔ اقبالؒ اور جناحؒ برصغیر میں ملتِ اسلامیہ کی آنکھوں کے تارے تھے۔ مسلمانوں نے ان کے چہروں کو نہ دیکھا۔ ان کے نماز روزوں کو نہ گنا گنایا وہ ان کے اتحاد و اخوت کے نعرے پر نقد دل و جان ہار گئے اور جب وقت آیا تو آگ اور خون کے دریا میں اتر کر آزادی کے گوہرِ مقصود کو پا گئے!

سردار عبدالقیوم کہتے ہیں۔

"اگر پاکستان کے اس نعرے میں پاکستان کا مطلب کیا "لاالہ الا اللہ" شامل نہ ہوتا۔ ایک قائداعظمؒ نہیں ہزار قائداعظمؒ ہوتے تو علیحدہ ریاست نہیں بن سکتی تھی۔" (نارووال)

قارئین فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ سردار عبدالقیوم کا ایک اور اشتعال انگیز مفروضہ ہے جو انہوں نے کلمۂ طیبہ کے بلند ترین مچان سے داغا ہے اور یہ خبر دے رہا ہے کہ اقبالؒ کو بداعمال گردانتے کے بعد ان کے پروگرام کی اگلی شق قائداعظمؒ کو بداعمال کہنا ہے۔

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دولت تو تیرہ سو سال پہلے محمد بن قاسم اس کفرستانِ ہند کو دے گیا تھا اور شاہانِ مغلیہ کے زوال کے بعد بھی اس کو بلند کرنے والے آتے رہے۔ خود انگریزوں سے برسرِ پیکار رہنے والے ہزاروں علماء دین جو کانگرس اور گاندھی کے حامی اور حلیف تھے عمر بھر کلمہ طیبہ پڑھتے اور سناتے رہے اور اپنے مخالف مسلمان رہنماؤں کو بے دینی اور بدعملی کے طعنے دیتے رہے پھر کیوں لا الہ الا اللہ کے یہ علمبردار استقلالِ اسلام کے لیے یہاں زمین کا ایک مربع اینچ ٹکڑا حاصل نہ کر سکے۔ لہٰذا بات صرف نعرے کی نہیں نعرہ بلند کرنے والے کی بھی ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور (بالِ جبریل)

محمد علی جناح کو کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی دھمکی راہِ حق سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ کلمہ

طیبہ کی روح ان کی گفتار میں بھی بس رہی تھی اور ان کے کردار میں بھی کارفرما تھی اور وہی انہیں قائداعظمؒ بنا گئی اور مسلمانوں کو اقلیت سے قوم کر گئی اور یوں اس وقت کی دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آئی۔

سردار عبدالقیوم کی اس خلاف اقبال مہم کو ایک اور پس منظر میں دیکھنا بھی ضروری ہے اِس قسم کی متعدد اطلاعات سعودی عرب میں ملیں کہ بھارت میں اقبالؒ کے خلاف ایک مسلمان عنصر تیار کیا گیا ہے جو بڑی تیزی سے عرب ممالک میں ——— سرگرم عمل ہے۔ اِس سلسلے میں سردار عبدالقیوم کا ان فارسی اشعار کی طرف اشارہ جو اقبالؒ نے متحدہ قومیت کے ضمن میں مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں کہے تھے خالی از علت نہیں۔ اس جملے پر غور کیجئے۔

"علامہ اقبالؒ کی جامع شخصیت تھی مگر ان کی شخصیت بصیرت اور متصوفانہ ——— خیالات کے بارے میں بھی منفی خیالات ہو سکتے ہیں"

سوال یہ ہے کہ سردار عبدالقیوم اس طرح کے مبہم کلیئے کیوں طے کرنا چاہتے ہیں، فقط اِس لیے کہ انہیں اقبالؒ کی ذات سے کلیتاً کدا ور بغض ہے ورنہ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؒ کی بصیرت فلاں مسئلے میں خطا کر گئی یا تصوف میں ان کا فلاں خیال قابلِ قبول نہیں لیکن اگر وہ صاف لفظوں میں واضح نکات پر تنقید کرنے کی بجائے اقبال پر یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں تو ان کے سامعین اور قارئین کو ان کی دیانت پر شبہ کرنے کا پورا حق ہے اور ان پر یہ الزام قائم ہے کہ وہ اقبالؒ کی ذات کو زیرِ بحث لا کر پاکستان کی فکری اساس کو ڈھانے کے درپے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پاکستان کے تصوّر کے خالق اور ملّت کے شاعر اور اسلام کے مفکرؒ کی حیثیت سے جو انتہائی اہم اور منفرد مقام علامہ اقبالؒ کو حاصل ہے وہ سردار عبدالقیوم کی جان کا آزار ہو رہا ہے اور اِسی لیے وہ اقبالؒ کی ذات پر اوچھے وار کر رہے ہیں کٹ حجتی، کج بحثی اور فتنہ انگیزی (جو عالمانہ مناظرے کرنے والے تفرقہ پرداز نام نہاد

علماء کی خصوصیتیں ہیں) اس مذموم مہم میں ان کے خاص ہتھیار ہیں۔ ان کا سینہ اقبال کے خلاف حسد اور بغض اور عناد سے یوں مشتعل ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان اور سنّتِ رسولؐ کی عظمت کو بھی (معاذاللہ) اس آگ میں ڈالنے سے دریغ نہیں کیا۔ یہ کیسا ایمان ہے جو ایک نیک نام مرحوم مسلمان کو چھوٹی گالی دینے سے سلب ہو جاتا ہے اور بڑی گالی دینے سے بچ جاتا ہے اور یہ سنّتِ رسولؐ کی کیسی عظمت ہے جو رسولؐ کے ایک نام لیوا پر پس مرگ ہلکا الزام لگانے سے (نعوذ باللہ) گھٹ جاتی ہے اور سنگین الزام لگانے سے بڑھ جاتی ہے۔ اپنے ایمان کو سردار عبدالقیوم جس بھاڑ میں چاہیں جھونک دیں۔ اقبالؒ بیچارے کی ذات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے مقابل کھڑا کر دینا آخری درجے کی اشتعال انگیزی اور بدترین قسم کا ظلم ہے۔

ایک عام سمجھ بوجھ کا آدمی یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ جو سردار عبدالقیوم نے اقبالؒ کے خلاف الزام و دشنام شروع کیا ہے اور اس میں ایک طرف اپنی شریعت طریقت اور اپنا ایمان عمل اور دوسری طرف سنّتِ رسولؐ کی عظمت، سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟ سردار عبدالقیوم کہتے ہیں۔

"میں نے اللہ کے فضل سے اپنا سب ... کچھ اس ملک کو دیا ہے لیا کچھ نہیں۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے کوئی مکان بنایا ہو جائیداد خریدی ہو . . . کوئی تجارت کی ہو اللہ کے فضل سے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میرے پاس جس قسم کا بھی مادی، ذہنی، فکری اور مالی اثاثہ تھا۔ وہ سب کا سب اس ملک پر صرف کیا ہے۔" (لاہور ۳)

ظاہر ہے سچ ہی کہتے ہیں۔ ان حالات میں سردار عبدالقیوم ایسے صاحب خلوص کے حق میں ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے عالم یا مفکر یا زاہد یا صوفی ہونے پر کسی کو اعتبار آئے نہ آئے یہ ہر کسی کو ماننا پڑے گا کہ وہ سیاست کے اکھاڑے کے مثالی فن کار ہیں ایسے فن کار جو فن برائے فن کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر سیاست دان اقتدار کے حصول کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ ایک عام سیاست دان کا مقصد زمین مکان جائیداد، بنک بیلنس، تجارت، کارخانے فارم وغیرہ کی شکل میں اپنے مالی اور مادی مفادات کو

آگے بڑھانا ہوتا ہے مگر سردار عبدالقیوم کی نظر میں ایسی کسی غرض کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں مخلص سیاست دان ہیں بلکہ سیاست دان مطلق ہیں یعنی صرف اقتدار حاصل کرنے کی خاطر اقتدار حاصل کرتے ہیں اور اقتدار کا اعلیٰ ترین درجہ ان کی نفسیاتی ضرورت ہے ان کی طبیعت کا اقتضاء ہے کیونکہ اس طرح اس دنیا میں ان کے اوپر سوائے پروردگار عالم کے اور کوئی نہیں ہوسکتا اور اس نے تو انہیں مامور فرما رکھا ہے "تاکہ نماز، زکوٰۃ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام سارے ملک میں نافذ کیا جا سکے۔ زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم ہو چکا نماز کا نظام قائم ہو چکا اور اچھے کاموں کے کرنے کی اور بُرے کاموں کے نہ کرنے کی تلقین قوم کو قدم قدم پر کی جا رہی ہے۔

سردار عبدالقیوم نے تو کچھ لوگوں کی گمراہی اور اپنے سٹاف کے بعض افراد کی بے علمی سے متاثر ہو کر وقت سے پہلے قیامت برپا کر دی یعنی ملک و قوم کے دو سب سے بڑوں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کو حشر سے پہلے قبروں سے نکال کھڑا کیا اور ان سے نماز اور کلمے کا حساب مانگ لیا۔ سردار عبدالقیوم کے اس اقدام سے ساری قوم کو کان ہو گئے ہیں اور بدعملوں پر رعشہ طاری ہے اور عین ممکن ہے وہ بھی ظاہری سُنّت کے پیرو اور باقاعدہ نماز روزے کے پابند ہو جائیں!

جب حاکم اپنے اقتدار کا مسئلہ یوں حل کر لے اور ملک و قوم کے حقیقی مسائل کو یوں بے حقیقت کر دے تو ہر طرف خیر ہی خیر ہے۔ خطرہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈاکٹر جاوید اقبال جیسا حقیقت شناس دانشور یہ کہنے لگے کہ یہ کیا منافقت کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ پھر سیاست دان مطلق جھانپ لیتا ہے کہ یوں تو راج سنگھاسن ڈول جائے گا اور وہ جھٹ اپنے نماز روزے اپنی ظاہری صورت اور باطنی کیفیت اپنا ایمان عمل یعنی اپنی شریعت طریقت اور محسنان ملک و ملت کے نیک نام اور بڑے کام اور سب سے بڑھ کر سُنّتِ رسولؐ کی عظمت سب ہی کچھ پورے خلوص کے ساتھ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے داؤ پر لگا دیتا ہے۔

بات سنتِ رسولؐ کی

سردار عبدالقیوم نے دعویٰ کیا ہے کہ اقبال پر بدعملی کا الزام انہوں نے سُنّتِ رسُولؐ کی عظمت کی خاطر لگایا ہے۔ اِس دعوے کی حیثیت کو مختصراً جانچنا ضروری ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے لفظ سُنّت راستہ، طریقہ، نہج، سیرت وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ قرآن یا حدیث میں کس کس معنی میں آیا ہے۔ صرف اصول فقہ میں اس کا مسلمہ مفہوم درکار ہے۔

مجدد الدین ابن الاثیر کے مطابق جب سُنّت کا لفظ ایک شرعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہو تو اس سے مُراد وہ امور ہوتے ہیں جن کا نبی کریمؐ نے حکم فرمایا ہو یا ان سے منع فرمایا ہو قول کے ذریعے یا فعل کے ذریعے اور وہ امُور ایسے ہوں کہ قرآن مجید میں ان کی تصریح نہ کی گئی ہو۔ امام الشاطبی کے نزدیک سنت کے تین معنی ہیں سُنّت کا ایک معنی بمقابلہ بدعت ہے دوسرا معنی اقوال و افعال رسُولؐ ہے اور تیسرا معنی یہ کہ "سُنت وہ احکام ہیں جن پر صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہو چاہے ان کا ذکر کتاب وسُنّت میں ہو یا نہ ہو"۔ وہ احکام جن پر صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہو سُنّت رسُولؐ میں اس لیے شامل ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے تم میری سُنت پر اور میرے خلفاء راشدین و مہدیین کی سُنّت پر رہو۔

سردار عبدالقیوم نے اپنی تقریروں میں بعض سُنّتوں کا ذکر کیا ہے۔

> "جب کسی کو دیکھتا ہوں کہ اس نے جوتا دائیں پاؤں سے پہنا ہے تو اس کے پاؤں چومنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے سنتِ رسُولؐ پر عمل کیا ہے۔ صدر ضیاء الحق میرے بڑے مہربان ہیں۔ مجھے مرشد کہتے ہیں اس سے زیادہ کسی کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں، لیکن اگر کبھی ان کو بائیں ہاتھ سے نوالہ لیتے ہوئے دیکھ لوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا ہاتھ کاٹ ڈالوں کہ اس میں سُنّتِ رسُولؐ کی خلاف ورزی ہے"۔ (لاہور ص۳)

سردار عبدالقیوم "فلسطین کی فتح" کے موقعے پر عیسائی اُمراء کی دعوت میں سیدنا عمرؓ

کے کھانا کھاتے کے بارے میں کہتے ہیں ۔

"کھانا کھا کے آخر میں آپ نے اُنگلیاں چاٹیں اور پلیٹ چاٹی ۔ ایک صحابی جو ساتھ بیٹھے تھے ان کے تہذیب و تمدن سے واقف تھے ۔ انہوں نے کہا خلیفہ المومنین ان کے ہاں یہ چیز معیوب سمجھی جاتی ہے تو انہوں نے غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اس کی طرف اور کہا . . . کیا تم چاہتے ہو کہ میں سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . . . ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں" (نادرے ۱)

اس کے بعد سردار عبد القیوم مشہور نومسلم یوسف اسلام کا ذکر کرتے ہیں جو پہلے بڑے پاپ سنگر تھے ۔ بتاتے ہیں کہ انہوں نے کھانا کھایا تو آخر میں اسی طرح اُنگلیاں بھی چاٹیں اور پلیٹ بھی چاٹی ۔

لاہور میں سردار عبد القیوم نے کہا ۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ نے رسولؐ سے جس عشق کا اظہار کیا ہے اور جو انہیں حضورؐ کی ذات سے تھا وہ سُنّتِ رسولؐ کے زمرے میں آتا ہے ۔ سُنّتِ رسولؐ صرف داڑھی رکھنے میں نہیں ہے"۔ (لاہور ۳)

حضور سرورِ کائناتؐ جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور یہ رحمت بالخصوص اُمّتِ مسلمہ کے لیے ہے ۔ اس رحمت کی ایک صورت حضورؐ کی سُنّتِ مطہرہ ہے جس پر چلنے میں دنیا اور آخرت کی فلاح ہے ۔ سُنّتِ مطہرہ کی رحمت کا سمندر اتنا وسیع ہے کہ ہر زمان اُمّت کے ہر فرد پر محیط رہتا ہے جو جہاں ہے جس حال میں ہے جس مقام پر چاہے اپنا دامن اس کے موتیوں سے بھر لے جسے اللہ نے فراغت اور خوشحالی عطا کی ہے ۔ سُنّت اسے صدقہ و خیرات سے رحمت ڈھونڈنا سکھاتی ہے جسے اللہ نے مفلس اور نادار رکھا ہے ۔ اس سے سُنّت کہتی ہے : سبحان اللہ الحمد للہ اللہ اکبر کے ذکر سے رحمت سے مالا مال ہو جائے جسے اللہ نے کھانا دیا ہے وہ اس کے آخر میں سُنّت کے مطابق اُنگلیاں اور تھالی پیالی چاٹ کر رحمت پالے ۔ جسے اللہ نے پہننے کے لیے جوتا دیا ہے وہ اسے دائیں پاؤں سے پہن کر رحمت اپنا لے ۔

یہاں پر تصریح بے حد ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی برکتیں ہوں یا سُنّتِ رسولؐ کی

رحمتیں نعمت کی تحدیث بندے کے اپنے حال اور مقام کے مطابق ہونا لازم ہے کیوں کہ مسئولیت اسی حال اور مقام کے حساب سے ہے مثلاً آدمی کے پاس مال و دولت ہے، تو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسُولؐ اس سے زکوٰۃ و صدقات کی مقتضی ہیں وہ انواع و اقسام کے کھانے کھا کر اُنگلیاں پلیٹ چاٹنے پہ یا ہر فیشن اور موسم کے مطابق قیمتی جوتے دائیں پاؤں سے پہننے پہ ہی اکتفا نہ کرے وہ اپنے مال اور دولت میں سائل اور محروم کا حق جانے اور ادا کرے اِس طرح کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے ننگے پاؤں پھرنے والوں کو جُوتے مہیا کرے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے سردار عبدالقیوم ——— کو حکومت عطا کی ہے وہ صرف اچھے کام کرنے کا حکم ہی نہ دیں صرف بُرے کاموں سے ہی منع نہ کریں، صرف کھانے کے بعد اُنگلیاں اور پلیٹ ہی نہ چاٹیں صرف جوتا ہی دائیں پاؤں سے نہ پہنیں۔ یہ باتیں تو ان سے کہیں بہتر اور زیادہ مؤثر انداز میں محلوں کی مسجدوں کے امام کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اصل میں اُنگلیاں اور پلیٹ چاٹنے اور جوتا دائیں پاؤں سے پہننے سے متعلق ان سُنتوں پر تو عمل کا پہلا اور زیادہ حق ان لوگوں کا ہے جو صرف کھانے کو کھانا اور پہننے کو جوتا حاصل کر سکتے ہیں اور جن کو ایک تنکا اِدھر سے اُدھر ہٹانے کا اختیار نہیں!

——— سردار عبدالقیوم اپنی جگہ سربراہِ مملکت ہیں۔ مسندِ اقتدار پر متمکن ہیں، انہیں خود اپنی قوت کا بڑا احساس ہے اور وہ عوام و خواص کو بھی اس کا احساس کراتے رہتے ہیں۔ وہ قومی خزانے پر تصرف کا خاصا اختیار رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان پر ان کے مقام اور ذرائع کے مطابق ان سُنتوں کی اطاعت لازم ہے مثلاً وہ ایسا انتظام کریں کہ سارے آزاد جموں و کشمیر میں اور سارے پاکستان میں بسنے اور پڑھنے والا کوئی ایک اِنسان ایسا نہ ہو جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے اور جس کے پاؤں میں جوتا نہ ہو۔ یہ انتظام ہو جائے۔ تو سردار عبدالقیوم لوگوں کو یہ تلقین کرنے کا حق رکھیں گے کہ کھانے کے بعد اُنگلیاں اور پلیٹیں چاٹنی ہیں اور جوتے دائیں پاؤں سے پہننا ہیں۔

سردار عبدالقیوم کہتے ہیں کہ ان کا اسلام وہی ہے جو خدا کے رسُولؐ اور صحابہ کرامؓ کا ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سیدنا عمرؓ اور سیدنا علیؓ کا نام لینا ضروری ہے۔ ایسا ہے

تو پھر چند لمحوں کے لیے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ رسول اللہؐ اور خلفاء راشدین کا بحیثیت سربراہ مملکت و ملت کیا عمل تھا اور سردار عبدالقیوم ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ کا بحیثیت صدر کیا عمل ہے۔ معاذاللہ یہاں کسی طرح کا کوئی تناظر یا تقابل پیش نہیں کیا جارہا۔ پندرھویں صدی ہجری کے ظاہری سُنّت کی پیروی اور نماز روزہ کی پابندی کرنے والے دو مسلمان جن کو قومی سیاست کی نیرنگیوں نے اُوپر آنے کا موقع دیا انگریز کے ایک لادینی سیاسی نظام کی بنیاد پر سُنّتِ رسولؐ کا پاکیزہ قلعہ تعمیر کرنے کے مدعی ہیں۔ آج کے ان دو حاکموں اور حضور خیرالبشر اور ان کے خلفائے راشدین کا ایک جگہ ذکر کرنا ہی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مگر اس اُمید پر کہ شاید اللہ ان بہترین خلائق نفوس قدسیہ کے مُبارک حوالے سے ہمارے حاکموں کے لیے اور ہمارے لیے کوئی خیر کی صورت فرما دے یہ چند حقائق و واقعات پیش کیے جارہے ہیں۔

۱۔ ابتدا سے رسول اللہؐ کا شیوہ وفائے عہد تھا جو وعدہ کر لیتے اس کو پورا کرتے۔ ہر خطبے میں یہ فرمایا کہ جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد نہیں اس کا دین نہیں۔[۵۵]

۲۔ رسول اللہؐ مال کو گھر میں رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ جو کچھ ہوتا تھا۔ شام تک ختم کر دیتے جو سائل آتا اس کو عطا فرماتے۔[۵۶]

۳۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر مٹی پھینکو۔[۵۷]

۴۔ رسول اللہؐ عمال کے احتساب کو مقدم رکھتے تھے۔ زکواۃ اور صدقہ وصول کرنے والوں پر کڑی نگاہ رہتی تھی کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی کا جو صدقہ وصول کر کے لائے تھے جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا۔ "یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیۃً ملا ہے۔" رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہ ملا۔" اس کے بعد ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔[۵۸]

۵۔ حجۃ الوداع کا سفر اتمام نعمت اور تکمیل دین کا سفر تھا۔ عہدِ نبوت کے اوجِ کمال کا سفر تھا۔ لیکن اس سفر میں رسول اللہؐ کے اُونٹ پر ایک ٹوٹا ہوا کجاوہ تھا جس پر ایک

پُرانی چادر پڑی ہوئی تھی۔ [۵۹]

۶۔ سیدنا صدیق رضؓ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم جو شخص رسُولؐ اللہ کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ زکوٰۃ میں دیتا تھا اگر وہ اس کے دینے سے انکار کرے گا تو میں اس کے مقابلے میں جہاد کروں گا۔" [۶۰]

۷۔ سیدنا صدیقؓ نے یزید بن ابی سفیان کو متنبہ کیا۔ "اے یزید تمہاری قرابت داریاں ہیں شاید تم ان کو اپنی امارت سے فائدہ پہنچاؤ۔ درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ رسُول اللہؐ نے فرمایا کہ جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی کو بلا استحقاق محض رعایت کے طور پر افسر بنا دے تو اس پر خُدا کی لعنت ہو اور خُدا اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ فرمائے گا۔ یہاں تک کہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔" [۶۱]

۸۔ سیدنا صدیقؓ کے زمانے میں زکوٰۃ عشر جزیہ اور غنیمت کی آمدنی بہت ہو گئی تھی۔ اسلامی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اس کو سیدنا صدیقؓ بلا تفریق آزاد و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ مرد و زن تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ روپیہ بانٹ دینے کے بعد بیت المال میں جھاڑو پھروا دیتے۔ [۶۲]

۹۔ جب سیدنا صدیقؓ کی وفات کا وقت آیا تو وصیت کی کہ میری فلاں زمین بیچ کر میں نے ذاتی اخراجات اور گزارے کے لیے جو رقم آج تک بیت المال سے لی ہے واپس کر دی جائے۔ [۶۳] ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ وہ اس رقم کے مطابق اُمّت کی خدمت نہیں کر سکے۔

۱۰۔ زکوٰۃ کے منکروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے وقت سیدنا صدیقؓ نے فرمایا:

"دین گھٹ جائے اور میرے جیتے جی"؟ [۶۴]

۱۱۔ سیدنا عمرؓ نے کبھی کوئی دربان یا محافظ نہ رکھا تاکہ لوگوں کو آپ تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔ روزانہ ہر نماز کے بعد مسجد کے صحن میں بیٹھ جاتے کہ جس کو جو کچھ کہنا ہو بلا روک ٹوک کہہ سکے۔

۱۲۔ سیدنا عمرؓ کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ رعایا کا کوئی فرد بھوکا نہ رہنے پائے چنانچہ ملک میں جتنے معذور یا کام کے ناقابل لوگ تھے کیا مسلم کیا غیر مسلم بیت المال سے سب

کے روز دینے مقرر تھے۔[۶۶]

۱۳۔ سیّدنا عمرؓ دولت کو بیت المال میں جمع کرنے کے خلاف تھے۔ فرماتے تھے۔ "یہ سب لوگوں کا حق ہی تو ہے جو انہیں ملتا ہے۔ . . . پھر جب فلاحی کاموں کے لیے رقوم موجود ہیں تو انہیں روکے رکھنے سے کیا حاصل"۔ ایک بار کسی عامل نے لکھا کہ سب لوگوں کو وظیفے دینے کے بعد بھی کچھ رقم بچ رہی ہے اس کا کیا کیا جائے؟ سیّدنا عمرؓ نے جواب دیا۔ "جو کچھ بچ رہا ہے اسے بھی عوام میں بانٹ دو"۔[۶۷]

۱۴۔ سیّدنا عمرؓ ایک دفعہ بیمار ہوئے دوا میں شہد تجویز ہوا لیکن بغیر مسلمانوں کی اجازت کے لینا منظور نہ تھا۔ مسجد نبویؐ میں لوگوں سے جا کر کہا اگر اجازت ہو تو تھوڑا سا شہد لے لوں۔[۶۸]

۱۵۔ سیّدنا عمرؓ کو رسول اللہؐ کی عسرت کی زندگی یاد رہتی تھی اچھا کھانا نہ کھاتے تھے۔ اچھا کپڑا نہ پہنتے تھے۔ فتوحات کے بعد مال غنیمت آنا شروع ہوا۔ سب کے وظیفے مقرر ہوئے تو ایک دفعہ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا۔ اب خدا نے کشادگی دی ہے۔ اچھے کھانے اور نرم کپڑوں سے پرہیز نہ چاہیئے۔ سیّدنا عمرؓ نے فرمایا تم رسولؐ اللہ کی تنگی کی زندگی بھول گئیں۔ خدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلوں گا کہ آخرت کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو"۔

۱۶۔ سیّدنا عمرؓ کے لباس میں صرف چند جوڑے موٹے کپڑے کے تھے۔ ان میں بھی پیوند پر پیوند لگے رہتے۔ ان ہی کپڑوں میں برسرِ عام نکلتے اور پھرتے تھے۔ سیّدنا امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا تو ان کے تہ بند میں بارہ پیوند تھے۔ بعض اوقات صرف ایک ہی جوڑا رہ جاتا تھا اور اسی کو دھو دھو کر پہنتے رہتے۔[۶۹]

۱۷۔ ایک بار حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے سیّدنا عمرؓ سے کہا۔

"امیر المومنین! اللہ نے آپ کو فراغت دی ہے۔ آپ کے پاس بادشاہوں کے سفیر اور عربوں کے وفد آتے ہیں اس لیے آپ کو اپنی زندگی میں تبدیلی لانی چاہیئے۔ فرمایا۔ "افسوس تم دونوں اُمہات المومنین ہو کر دنیا کی ترغیب دیتی ہو۔ عائشہؓ تم رسولؐ اللہ کی زندگی بھول گئیں جب تمہارے گھر میں

صرف ایک کپڑا تھا جسے آپؐ دن میں بچھاتے تھے اور رات کو اوڑھتے تھے۔ حفصہؓ تم کو یاد نہیں کہ ایک دفعہ تم نے فرش کو دہرا بچھا دیا تھا۔ اس کی نرمی کے سبب سے رسول اللہؐ رات بھر سوتے رہے اور جب بلالؓ نے اذان دی اُس وقت آنکھ کھُلی اور آپؐ نے فرمایا۔ حفصہ تم نے یہ کیا کیا کہ فرش کو دہرا بچھا دیا اور میں صبح تک سوتا رہا۔ مجھے دُنیاوی راحت سے کیا تعلق۔ تم نے فرش کی نرمی کی وجہ سے مجھے غافل کر دیا۔" [۷۱]

۱۸۔ سیدنا عمرؓ اپنے معمولی پرانے لباس میں بیت المقدس کے قریب پہنچے تو اسلامی افواج کے قائد اور بڑے صحابہ شہر سے باہر قیمتی پوشاک لیے حاضر ہوئے کہ وہ مفتوح عیسائیوں کی نظر میں ایک بڑی حکومت کے سربراہ کی شان اختیار کریں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا۔ "تم سب سے زیادہ ذلیل لوگ تھے پھر اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعے عزت دی تو جب بھی تم اسلام کے بغیر عزت چاہو گے اللہ تمہیں ذلیل کر دے گا۔" [۷۲]

۱۹۔ بیت المقدس میں قیام کے دوران حضرت بلالؓ نے سیدنا عمرؓ سے شکایت کی کہ امیرالمومنین! ہمارے افسر پرند کا گوشت اور میدہ کی روٹیاں کھاتے ہیں اور عام مسلمانوں کو معمولی کھانا بھی نصیب نہیں"۔ آپ نے تنخواہ کے علاوہ سپاہیوں کی خوراک بھی مقرر کر دی۔ [۷۳]

۲۰۔ سیدنا عمرؓ نے ایک بار عاملوں یعنی گورنروں کی کانفرنس بُلائی اور فرمایا۔ "یاد رکھو! میں نے تمہیں حاکم اور سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا . . . تم لوگ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرو . . . ان کی فریاد سُننے کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھو ورنہ زبردست کمزور کو کھا جائیں گے۔ خود کو عام مسلمانوں سے بہتر نہ جانو کیونکہ یہ بھی ظلم کی ایک شکل ہے۔" [۷۴]

۲۱۔ عاملوں کے پروانہ تقرری میں سیدنا عمرؓ کے حکم سے یہ عہد لیا جاتا تھا۔ "ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوں گا۔ باریک کپڑے نہ پہنوں گا۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھاؤں گا۔ دروازے پر دربان نہ رکھوں گا۔ ضرورت مندوں کے لیے دروازے ہمیشہ کھلے رکھوں گا۔" [۷۵]

۲۲۔ سیدنا عمرؓ نے سرکاری عہدے داروں کو ہدایت فرمائی۔ "تحفہ قبول نہ کیا کرو کیونکہ یہ بھی رشوت کی ایک شکل ہے۔" [۵۶]

۲۳۔ سیدنا عمرؓ کو مصر کے سرکاری عہدے داروں پر ناجائز آمدنی کا شبہ تھا اس لیے تحریر فرمایا۔ "تم دولت کے سوتوں پر بیٹھ گئے ہو۔ حرام طریقوں سے روپیہ کماتے ہو، حرام مال کھاتے ہو اور اپنی اولاد کو حرام کا وارث بناتے ہو۔" [۵۷]

۲۴۔ مصر کے عامل عمروؓ بن العاص کے بارے میں شکایت ہوئی کہ انہوں نے دریائے نیل کے کنارے ایک جامع مسجد بنوائی ہے اور اس میں ایک منبر بھی بنوایا ہے۔ سیدنا عمرؓ نے ایک خط میں فرمایا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک منبر بنوایا ہے جہاں مسلمانوں سے اُونچے ہو کر بیٹھتے ہو کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تم کھڑے ہو کر تقریر کرو اور باقی مسلمان بیٹھیں میری طرف سے تاکید ہے کہ منبر توڑ ڈالو۔" [۵۸]

۲۵۔ کوفہ کے دارالامارت میں چوری ہوئی تو سعدؓ ابن ابی وقاص نے اس کی پختہ عمارت بنوائی اور اس میں ایک پھاٹک بھی لگوایا۔ سیدنا عمرؓ کو پتہ چلا تو محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ وہاں پہنچ کر سعد کے محل کا پھاٹک جلا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پھر سیدنا عمرؓ کا خط دیا جس میں تحریر فرمایا تھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک محل بنوایا ہے جس کو تم قلعے کی طرح استعمال کرتے ہو ۔ ۔ ۔ یہی نہیں بلکہ تم نے اپنے اور عوام کے درمیان ایک پھاٹک بھی لگوایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمہاری کور دماغی کا محل ہے۔ اس کے صرف اس حصے میں رہو۔ جو خزانے کے متصل ہے باقی عمارت بند کر دو محل میں پھاٹک نہ لگواؤ جس سے لوگوں کو اندر آنے اور اپنی ضروریات تمہارے سامنے پیش کرنے میں رکاوٹ ہو۔" [۵۹]

۲۶۔ عتبہ بن فرقد نے سیدنا عمرؓ کو حلوا بھیجا۔ انہوں نے چکھا اور کہا۔ "یہ تو بہت مزیدار ہے کیا عتبہ کی فوج کے سب لوگ یہ حلوا کھاتے ہیں"؟ لانے والے نے کہا نہیں تو آپ نے بے حد ناراضگی کے عالم میں عتبہ کو لکھا۔

"حلوہ نہ تو تمہاری محنت کا پھل ہے نہ تمہارے ماں باپ کی محنت کا بلکہ مسلمانوں کے خون پسینے سے تم کو حاصل ہوا ہے اِس لیے تمہارے لیے مناسب ہے کہ تم وہی غذا کھاؤ جس سے تمہاری فوج کے باقی مسلمان اپنے گھر پر سیر ہوتے ہیں۔ جس غذا سے تم خود سیر ہوتے ہو وہی باقی مسلمانوں کو بھی دو"۔ ص۸۰

۲۷۔ مجاشع بن مسعود سلمی ممتاز سالارِ فوج اور محصل رہ چکے تھے ان کی بیوی خضیرا نے بصرے میں اپنے گھر کو سجایا اور دروازوں پر پردے لٹکائے۔ سیدنا عمرؓ نے گورنر بصرہ کو تحریر فرمایا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ خضیرا نے اپنا گھر پردوں سے سجایا ہے جس طرح خانہ کعبہ سجایا جاتا ہے۔ میرا خط ملنے کے بعد یہ پردے پھاڑ دو۔ خدا اس گھر کو رسوا کرے"۔[۸۱]

۲۸۔ ایک مرتبہ عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک قبطی کے بے وجہ مارا۔ سیدنا عمرؓ نے اسے بھرے مجمعے میں اس قبطی کے ہاتھوں سزا دلوائی اور گورنر باپ اور اس کے بیٹے سے فرمایا: "تم لوگوں نے انسانوں کو غلام کب سے بنا لیا۔ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا"۔

۲۹۔ سیدنا عمرؓ کے زمانے میں حکومت کے عمال بلکہ خود خلیفہ بھی رعایا کے ایک معمولی فرد کے برابر تھا۔ ہر شخص کو اس پر نکتہ چینی کا اختیار تھا۔ عورتوں کے مہر کی حد مقرر کرنے کی بات سیدنا عمرؓ نے شروع کی تو مسجد کے کونے سے ایک عورت نے قرآن کا حوالہ دیا۔ انہوں نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اِسی طرح دو یمنی چادروں کا کُرتا پہنے ہوئے جب سیدنا عمرؓ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو ایک شخص نے ٹوک دیا۔ "ہر مسلمان کو ایک چادر ملی ہے جس میں کُرتا نہیں بن سکتا اور تم نے کُرتا پہن رکھا ہے"۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے کہا۔ "اس کا جواب تم دو"۔ عبداللہؓ نے کہا۔ "میں نے اپنے حصّے کی چادر والد کو دے دی تھی۔ اس طرح یہ کُرتا پُورا ہوا"۔[۸۳]

۳۰۔ سیدنا عمرؓ اپنے عزیز و اقارب کے کردار اور افعال پر کڑی نظر رکھتے اور انہیں تنبیہ کرتے۔ "عام لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف ہیں۔ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی قانون شکنی کی

تو میں دوگنی سزا دوں گا۔"[۸۴]

۳۱۔ جب مدینہ میں قحط پڑا اور سیدنا عثمانؓ کے ایک ہزار اُونٹ غلّہ لے کر پہنچے، تو انہوں نے تمام غلّہ اہلِ مدینہ میں تقسیم کرا دیا۔[۸۵]

۳۲۔ سیدنا عثمانؓ فرماتے ہیں۔ "دنیا میں تین باتیں مجھے بہت عزیز ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا ننگوں کو کپڑا پہنانا اور قرآن شریف پڑھنا پڑھانا۔"[۸۶]

۳۳۔ سیدنا عثمانؓ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خلفا کو حکم دیا ہے کہ محافظ بنیں، محصل نہ بنیں۔ اس اُمّت کے صدر نشین حفاظت کرنے والے بنیں۔"[۸۷]

۳۴۔ ایک اور موقعے پر سیدنا عثمانؓ نے فرمایا۔[۸۸] لوگو! تمہیں بولنے والے سے زیادہ انصاف کرنے والے حاکم کی ضرورت ہے۔

۳۵۔ سیدنا عثمانؓ نے تنبیہ فرمائی۔ "جس نے لوگوں کا حق نہ پہچانا اس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی نہ پہچانا۔"[۸۹]

۳۶۔ حامیوں نے دشمن بلوائیوں کے خلاف لڑنے کی اجازت مانگی تو سیدنا عثمانؓ نے فرمایا۔ "آج میری سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ کوئی میرے لیے تلوار نہ اُٹھائے۔"[۹۰]

۳۷۔ سیدنا علیؓ فرماتے ہیں۔ "جو شخص اپنے کو عوام کا قائد جتائے۔ اسے چاہیئے کہ دوسروں کو تعلیم دینے سے قبل اپنی ذات کو تعلیم دے۔ اس کا کردار اس کی زبان سے پہلے ادب سکھائے اور نمونہ دکھائے۔"[۹۱]

۳۸۔ ایک مرتبہ سیدنا علیؓ نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ یہاں بے انتہا علم ہے کاش اس کے اُٹھانے والے مل جاتے! ہاں کچھ لوگ حاصل کرنے کے خواہش مند ضرور ہیں مگر ان کی طرف سے اطمینان نہیں کیونکہ وہ دین کو دنیا کا آلہ بنانے والے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے بندوں پر رعب ڈالنے والے ہیں اور حجتوں سے اولیاء پر برتری چاہنے والے ہیں۔"

۳۹۔ ایک اور موقع پر سیدنا علیؓ نے ارشاد فرمایا۔ "بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو احسان اور نعمتوں کی وجہ سے جہنّم کے قریب ہو رہے ہیں۔۔ ۔۔ اور بہت سے وہ ہیں جو نیکنامی

کے سہارے فتنہ و فساد کر رہے ہیں۔"[۹۳]

۴۰۔ سیدنا علیؓ اپنی ذات پر اور اپنے متعلقین پر بیت المال کی معمولی چیز بھی صرف نہ ہونے دیتے تھے۔ معمولی سے گھر میں رہتے تھے۔ ساری عمر کوئی عمارت نہ بنوائی۔ آپ کے سامان میں ایک مینڈھے کی کھال تھی جس پر رات کو سوتے تھے اور دن کو اسی پر مویشی کو چارہ دیتے تھے۔ اوڑھنے کے لیے ایک مختصر سی چادر تھی کہ اگر سر چھپاتے تھے تو پاؤں کھل جاتا تھا اور پاؤں ڈھانکتے تھے تو سر برہنہ ہو جاتا تھا۔ یہی چادر مدینہ سے کوفہ لے گئے تھے۔ نیز سردی میں بھی اسے ہی اوڑھتے اگرچہ بدن کانپتا رہتا۔[۹۴]

۴۱۔ سیدنا علیؓ عمال کے اعمال و افعال کا احتساب فرماتے تھے۔ ایک والی کے متعلق معلوم ہوا کہ اپنے فرائض چھوڑ کر سیر و شکار کو نکل جاتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ اسے معزول کر دیا۔ ایک اور عامل کے خلاف شکایتیں موصول ہوئیں تو اسے تحریر فرمایا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہو . . . تمہارے دسترخوان پر الوان نعمت ہوتے ہیں۔ منبر پر تم صدیقین کا وعظ کہتے ہو اور خلوت میں اہل اباحت کا عمل ہے . . . . تم ہواؤں اور یتیموں سے حاصل کیے ہوئے مال سے عیش و تنعم میں ڈوب کر خدا سے صالحین کے اجر کی توقع کس طرح رکھتے ہو . . . ."[۹۵]

۴۲۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا شمار بھی خلفاء راشدین میں کیا جاتا ہے۔ خلافت ملنے سے پہلے اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس اور جامہ زیب آدمی مانے جاتے تھے۔ خلیفہ ہوتے ہی ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ لوگوں سے عام بیعت لینے کے بعد شاہی سواری قبول نہ کی اور اپنے خچر پر گھر آئے۔ اس بڑی ذمہ داری کے بوجھ سے بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ لونڈی نے پوچھا۔ "خیر ہے؟ اتنے متفکر کیوں ہیں؟" فرمایا۔ "اس سے بڑھ کر فکر اور تشویش کی بات کیا ہو گی کہ مشرق و مغرب میں اُمتِ محمدیہؐ کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔"[۹۶]

۴۳۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ نامزد کیا تھا۔ حالانکہ ان کے نزدیک ایسا انتخاب شوریٰ سے ہونا چاہیئے تھا۔ اس لیے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے

بعد دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمانوں کو جمع کر کے کہا۔" لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھے خلافت کی ذمہ داریوں میں مبتلا کیا گیا ہے اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے میں خود اسے اُتارے دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو"۔ لیکن جب لوگوں نے کہا ہم سب آپ کی خلافت پر راضی ہیں۔ آپ خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیجیے تو حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔[۹۷]

۴۴۔ بنی اُمیہ کے خلفاء بیت المال کا بڑا حصہ ذاتی تعیش اور حکومت کے ظاہری شان و شوکت پر صرف کرتے تھے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے تمام غیر ضروری اخراجات بند کر دیئے اور بیت المال کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے مخصوص کر دیا۔[۹۸]

۴۵۔ جب حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے خاندان کی ظلم و جبر سے حاصل کی ہوئی جاگیروں کو ان کے اصل مالکوں اور حق داروں کی طرف لوٹانے کا فیصلہ کیا تو ان کے عزیز و اقارب ان کے خلاف کھڑے ہو گئے مگر حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے سب سے پہلی اپنی ذاتی جاگیر اور جائیداد چھوڑی اور پھر پورے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی۔ یہی عمل سارے ملک میں دُہرایا گیا جو حق دار لوگ مر چکے تھے۔ ان کے ورثا کو جائیدادیں لوٹائی گئیں۔[۹۹] اس حق رسی کی کوئی نظیر دُنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

۴۶۔ ملک میں سب مجبور اور معذور اشخاص کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے گئے اور ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔ جو قرضدار ناداری کے سبب سے قرض ادا نہ کر سکتے تھے۔ ان کے قرض ادا کرنے کے لیے مد قائم کی گئی۔ شیر خوار بچوں کے وظیفے مقرر ہوئے۔ ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقرا اور مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ اس سے علاوہ تمام ملک کے حاجت مندوں میں صدقات تقسیم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے ایک شخص کو صدقات کی تقسیم کے لیے ایک دُوسرے شہر میں جانے کا حکم دیا اس نے عذر کیا۔ امیر غریب میں امتیاز کیسے کروں گا۔ فرمایا۔" جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دے دینا"۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز صرف ڈھائی برس خلیفہ رہے لیکن اس مختصر عرصے

ہیں ملک کا نقشہ بدل گیا۔ لوگ عمال کے پاس صدقات لے کے جاتے تھے اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا۔[۱۰۰]

۴۷۔ بنی اُمیّہ دشمنی کے سبب سے امیر معاویہ کے زمانے سے منبروں سے خطبوں میں سیدنا علیؓ پر لعن طعن کرتے تھے اور یہ ان کا دستور بن گیا تھا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس مذموم رسم کو بھی مٹا دیا اور خطبے میں اس کی جگہ قرآن مجید کی ایک آیۂ مبارکہ کی تلاوت کو رائج کیا۔[۱۰۱]

چند سیدھے سادے سوال

سُنّتِ مطہرہؐ کا یہ بظاہر چھوٹا سا لیکن درحقیقت بہت عظیم آئینہ بالخصوص مسلمان سربراہانِ حکومت و مملکت کے دیکھنے کی چیز ہے کیا سردار عبدالقیوم بھی اس پاکیزہ آئینے میں اپنے خدوخال دیکھنا گوارا کریں گے۔ راقم اس سلسلے میں ان کی سہولت کے لیے اس طرح کے سوالات پیش کر سکتا ہے۔

کیا ہمارے سربراہانِ ملک اپنے اور اپنے متعلقین کے کھانے پینے پہننے اوڑھنے رہنے سہنے چلنے پھرنے کے خرچ اور اپنی مجلسی سیاسی اور سفارتی ملاقاتوں اور استقبالیوں دعوتوں ضیافتوں ظہرانوں اور عشائیوں میں اور اپنے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سفر اور دوروں میں ہونے والے اخراجات کا کوئی ماہوار یا سالانہ اندازہ اپنے عوام کو دے سکتے ہیں؟ ——— کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی باقاعدہ تنخواہوں الاؤنس یا دیگر مالی اور مادی مراعات کا بلحاظ منصب سُنّتِ رسولؐ سے کیا تعلق ہے؟ کیا ان کے ملکی سربراہ بننے سے پہلے کی اور اب کی ملکیت یا جائیداد کی تفصیل ان کے جمہور کو اسی طرح معلوم ہے جس طرح خلفائے راشدین کی املاک کی؟

کیا ہمارے حاکم لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ اپنی گھریلو تقریبوں میں برطانوی دور کی غیر ملکی حاکموں کی روایات مثلاً سُرخ بانات کا بچھانا اور چار گھوڑوں والی بگھی میں سوار ہونا اور ایسی ہی دیگر شان و شوکت اور فخر و تمکنت کی نمائشوں کا سُنّتِ رسولؐ کے پیش نظر کیا جواز ہے؟

اُن گیٹ کیپروں، چوکیداروں، پہرے داروں، محافظوں، اہلکاروں اور سیکرٹریوں کا شمار کیا ہے جو صدر مملکت کے نفسِ نفیس اور ان سے ملنے والے ایک عام آدمی کے درمیان حائل ہیں؟ ان آہنی اور غیر آہنی پھاٹکوں اور دیواروں کی تعداد کیا ہے جو ان کے اور عوام کے درمیان کھڑی ہیں؟ تین خلفائے راشدین شہید ہوئے۔ پہرے دار اور ذاتی محافظ کا تصوّر سُنّتِ رسولؐ میں کیوں داخل نہ ہو سکا؟ سربراہانِ حکومت و مملکت کے تشریف لانے اور لے جانے کے لیے آج کا یہ سیکورٹی سسٹم اور سیکیورٹی سٹاف، یہ پائلٹ موٹر سائیکلیں اور جیپیں، یہ باڈی گارڈ اور روڈ پوسٹ، یہ عوام کے لیے ٹریفک کی بندشیں اور پابندیاں اور متبادل راستے، یہ سائرن اور ہوٹر یہ گھگھو اور بھونپو کیا یہ سب کچھ اس موت کو ٹالنے کی تدبیریں ہیں جو آجاتی ہے تو ایک گھڑی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی یا اپنے کروفر اور رعب و دبدبہ سے بے چارے لوگوں کو پریشان کرنے کی ترکیبیں ہیں جو اپنی زندگی کے معمولات میں پہلے ہی حیران و سرگرداں ہیں؟ بہرحال آنے جانے کی یہ دھوم دھام سُنّتِ رسولؐ کے کس تقاضے کی اطاعت میں ہے؟

جس بے دریغی، بے دردی اور بے پروائی سے ملکی خزانے کا لاکھوں، کروڑوں اربوں روپیہ بیرونِ ملک دوروں سے اور اندرونِ ملک نجی اور سرکاری منصوبوں اور کارپوریشنوں اور کاروباری اداروں اور بنکوں میں غبنوں اور قرضوں اور دھاندلیوں سے سال بسال برباد ہو رہا ہے وہ سُنّتِ رسولؐ کی کس شق کے تحت آتا ہے اور جن حیلوں بہانوں اور تاویلوں سے اس بربادی کے ذمّہ دار افراد کے نام چھپائے جا رہے ہیں وہ سُنّتِ رسولؐ کی کس ذیل میں آتے ہیں؟

زکوٰۃ نافذ کی گئی الحمد للہ جزاک اللہ احسن الجزا مگر یہ کیا کہ جو چاہے دے جو نہ چاہے نہ دے مزید یہ کہ جو حکومت زکوٰۃ نافذ کرتی ہے اسی حکومت کے محکمے اور ادارے اپنی سکیموں میں سرمایہ لگانے والوں کو سود کی زیادہ شرح پیش کرتے ہیں اور اشتہار تک دیتے ہیں کہ زکوٰۃ نہیں کٹے گی؟ ایک قدم حق کی طرف اٹھایا تھا اسے بھی باطل کر

لیا ! یہ سُنّتِ رسُولؐ کے ساتھ اخلاص ہے یا منافقت ؟

بہ حیثیت سربراہ مملکت کتنے اور کیا کیا وعدے کئے اور کتنے اور کون کون سے وعدے وفا کئے ؟

کیا ملک کے بھوکوں ننگوں، یتیموں اور بیواؤں، ناداروں، معذوروں، بوڑھوں اور بیکاروں کا رجسٹر تیار ہوا اور ان کے روزینوں کا انتظام ہوا ؟ غریب مریضوں کے لیے کتنے خیراتی ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم ہوئیں ؟

عوام کی جان مال عزّت کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کیے گئے ؟ کیا ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دیہات کے راستے اور شہروں کی سڑکیں اور عوام کی زندگی کا امن چین چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں اور تخریب کاروں سے محفوظ کیا گیا ؟

کیا سرکاری محکموں اور اداروں اور دفتروں کے افسروں، کلرکوں اور اہلکاروں اور تاجروں اور دلالوں اور دکانداروں کے رشوت، مہنگائی اور ملاوٹ کے عوام پر کسے ہوئے شکنجے ڈھیلے کرنے کی کوئی ملک گیر تدبیر کی گئی ؟ مثلاً کیا سردار عبدالقیوم نے ٹی وی پروگرام "میں اور آپ" میں اس لمبی سفید داڑھی والے ظاہری سُنّت کے پیرو بزرگ کے اس فقرے کا نوٹس لیا کہ "غریبوں کو ریل میں بھر کے سمندر میں پھینک دو" ؟

مشاہدے میں آیا ہے کہ جس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر عوام مہینوں بلکہ برسوں اندھیرے اُجالے میں گرتے پڑتے آتے جاتے رہتے ہیں وہ صدر مملکت کی دو ایک گھنٹے کی تشریف آوری کے لیے تین چار روز میں مرمت بھی ہو جاتی ہے اور چمک دمک بھی اُٹھتی ہے ایسا کیوں ہے ؟ اگر وہ سڑک سربراہِ مملکت کے لیے ٹھیک ہو سکتی ہے تو عوام کے لیے کیوں ٹھیک نہیں ہو سکتی ؟ یا اگر عوام کی آمد و رفت اسی شکست و ریخت میں اس پر ہو سکتی ہے تو صدر مملکت کا گزر اس پر کیوں نہیں ہو سکتا ؟ کیا سردار عبدالقیوم سُنّتِ رسُولؐ کے پیشِ نظر ان سوالوں کا جواب دیں گے ؟

کیا سُنّت رسُولؐ کی رو سے صدر مملکت اس امر کے مکلّف نہیں ہیں کہ وہ اس ملک کے ہر شہری کی بات سُنیں اور اس کے ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دیں ؟

کیا سُنّتِ رسُولؐ کا اقتضاء یہ نہیں کہ صدر آزاد جمّوں وکشمیر اور صدر پاکستان اپنے ہر ہر ہم وطن کی جسمانی ذہنی اخلاقی اور رُوحانی فلاح کے ذاتی طور پر ذمّے دار اور جواب دہ ہوں؟

سُنّت رسُولؐ کی رُو سے مُسلمانوں کے سربراہ حکومت یا مملکت کی یہ ذاتی ذمّے داری یہ مسئولیت یہ احساس کہ مجھ سے پُوچھا جائے گا۔ اس قدر بیّن اور حتمی ہے کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں امر میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے یا میری راہ میں آئینی مشکلات ہیں یا یہ فلاں فلاں کی ذمّے داری ہے یا یہ صوبائی معاملہ ہے یہاں اس کا کوئی عذر نہیں چل سکتا کوئی نیشنل اسمبلی یا سینٹ یا پارلیمنٹ اس کے اور اس کے فرائض کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔ اپنے عوام کی فلاح کے سلسلے میں وہ براہِ راست اللہ کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہے!

سیّدنا صدّیقؓ نے بارِ خلافت اُٹھایا تو تجارت چھوڑ دی خلقِ خدا کی خدمت میں لگے رہتے اکثر رات قیام اور دن روزے میں گزرتا۔ عبرت پذیری حد کو پہنچی ہوئی تھی اتنا روتے کہ ہچکی بندھ جاتی۔ کوئی سرسبز درخت دیکھتے تو فرماتے۔ کاش میں درخت ہوتا کہ آخرت کے خطروں سے محفوظ رہتا۔ چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو فرماتے پرندو تم خوش قسمت ہو کہ دنیا میں اُڑتے چُگتے ہو اور درختوں کے سائے میں بیٹھتے ہو اور قیامت کے محاسبے کا کوئی خطرہ نہیں۔ کاش ابوبکر تمہاری طرح ہوتا۔ بات بات پہ ٹھنڈی آہ بھرتے تھے![۱۰۲]

سیّدنا عمرؓ اکثر قرآن مجید کی ایسی سورتیں پڑھتے جن میں اللہ کی عظمت و جلال کا مضمون ہوتا اور زار زار روتے۔ ایک بار فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ بے مواخذہ چھوٹ جاؤں۔ ایک دفعہ راہ سے تنکا اٹھا کر فرمایا "کاش میں بھی ایک تنکا ہوتا یا کچھ بھی نہ ہوتا، کاش میری ماں مجھے نہ جنتی"۔[۱۰۳]

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ عشاء کے بعد اکیلے میں رو رو کر دُعائیں کرتے تھے۔ اسی حالت

میں آنکھ لگ جاتی۔ جاگتے تو پھر وہی شغل رہتا۔ ساری ساری رات گریہ وزاری میں گزر جاتی۔ خلافت کی ذمہ داریوں اور اُمّت کے حقوق کے ڈر سے کانپ کانپ اُٹھتے۔ لوگوں سے فرماتے۔ "مجھے رونے پر ملامت نہ کرو کیونکہ فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے میں عمر پکڑا جائے گا۔[۱۰۴] ایک بار آپ کی بیوی نے یہ اصرار اور بلغرض نصیحت رات کی آہ و بکا کا سبب پوچھا تو فرمایا۔

"میں نے اپنے بارے میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں اس اُمّت کے چھوٹے بڑے اور سیاہ و سپید جملہ امُور کا ذمہ دار ہوں اس لیے جب میں ان بے کس، غریب، محتاج فقیر گمشدہ اور اس طرح کے دوسرے آدمیوں کو یاد کرتا ہوں جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور خدا ان کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے مُدعی ہوں گے ایسی حالت میں اگر میں خدا کے سامنے کوئی معقول عذر اور دلیل نہ پیش کر سکا تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں"۔

کاروبار سیاست و جہاں داری میں سُنتِ رسُولؐ کی اصل دین یہی ذاتی ذمہ داری اور براہِ راست مسئولیت کا احساس ہے جو سچے مسلمان حاکم کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے۔ ع

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

(بالِ جبریل)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سردار عبدالقیوم کے اقبال کے خلاف الزام کو چاہے وہ "بدعملی" کا الزام ہو یا "بے عملی"، "کوتاہی"، "غفلت" یا "لغزش" کا "کمی" کا الزام ہو یا "مسلسل ترک خیر" کا سُنّتِ رسُولؐ کے اس مختصر سے نقشے کی روشنی میں دیکھا جائے۔

آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔ "مُردوں کو بُرا نہ کہو اس لیے کہ وہ اپنے اعمال کو پہنچ چکے"۔[۱۰۵]

جاہلیت میں مجرم ہاتھ نہ آتا تھا تو عرب اس کے باپ یا بیٹے سے مواخذہ کرتے

تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "ہاں مجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار ہے۔ ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار نہیں۔" [۱۰۷]

سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا۔ کسی سزا یافتہ کو یا کسی چور کو پکڑتا ہوں تو اس وقت دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ اللہ اس کی پردہ پوشی کرے۔

ایک عجیب نکتہ سیدنا ابوبکرؓ نے بیان فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن مجید میں اہلِ جنت کا ذکر کیا ہے وہاں نیک عمل کرنے کی وجہ سے ان کی تعریف کی ہے اور ان کی برائیوں سے چشم پوشی کی ہے۔" [۱۰۹]

سیدنا عثمانؓ نے فرمایا۔ "سب سے بڑا غلط کار وہ ہے جو لوگوں کی برائیوں کا چرچا کرتا پھرے۔" [۱۱۰]

ایک اور موقعے پر سیدنا عثمانؓ نے ارشاد فرمایا۔ "ہر چیز اور ہر کام کے لیے آفت اور مصیبت ہوتی ہے اس امت کی آفت اور مصیبت عیب لگانے والے اور طعن تشنیع کرنے والے ہیں۔" سیدنا علی نے فرمایا۔ "(اللہ سے) ڈرو۔ اللہ کی قسم! اس نے گناہوں کو یہاں تک چھپایا کہ گویا بخش دیا۔" [۱۱۱]

سردار عبدالقیوم نے ڈاکٹر جاوید اقبال پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے مرحوم "والد محترم" علامہ اقبال کی موہوم بدعملی کا دیس پردیس ڈھنڈورا پیٹا۔ سُنتِ رسولؐ کے مندرجہ بالا شواہد کے پیشِ نظر آدمی سردار عبدالقیوم کو کیا سمجھے اور ان کے اس فعل کو کیسے بیان کرے جس کا ارتکاب انہوں نے اپنے زعم میں سُنّتِ رسولؐ کی عظمت اور اپنے ایمان کی حفاظت کی خاطر کیا؟ سردار عبدالقیوم ایسی ناحق الزام تراشی کے لیے کوئی اور بنیاد ڈھونڈیں مثلاً چانکیہ یا میکیاولی کی تعلیمات کی، سُنّتِ رسولؐ کی بنیاد پر ایسا کرنا سُنّتِ رسولؐ کی برملا توہین ہے۔

یہ صرف چند اشارے ہیں لیکن ان سے اس کیفیت کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے جو ایک اسلامی ملک کے سربراہ کے ہمہ وقت شاملِ حال رہنی چاہیے۔ اِس کیفیت کا مزاج تقریروں، وعظوں، نصیحتوں، چٹکلوں، قہقہوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ کیفیت مسلمان حاکم کو اس وقت عطا ہوتی ہے جب اسے عوام کے مسائل کا براہِ راست علم ہو ملک کے وسائل کا صحیح ادراک ہو اور اللہ کی مخلوق سے اتھاہ ہمدردی ہو جب اس کے سینے میں خدمتِ خلق کا بے لوث جذبہ تڑپ رہا ہو اپنی ذات اور اپنے متعلقین سے پوری بے پروائی ہو جب آخرت میں محاسبے کا ہر آن بے چین رکھنے والا خوف اس کے دل میں ہو اور ہمہ وقت رجوع الی اللہ اس کے شعور کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہو! یہ کیفیت مسلمان حاکم پہ وارد رہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کی گیدڑ سنگھی تو اس کو مل جائے لیکن عوام کے مسائل حل کرنے کی گیدڑ سنگھی اس کے ہاتھ نہ آسکے!

سردار عبدالقیوم کے لیے نہ صرف سُنّتِ رسولؐ کی عظمت کا تصور صحیح کرنا ضروری ہے بلکہ اسے وسعت دینا بھی انہیں لازم ہے۔ ان کو یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ وہ صرف اور صرف سیاست دان ہیں۔ ظاہری سُنّت کی پیروی اور نماز روزے کی پابندی بڑی قابلِ قدر خوبیاں ہیں لیکن ان خوبیوں سے انہیں کسی عالمِ دین یا حامیٔ شرعِ متین کی حیثیت نہیں حاصل ہو جاتی کہ وہ علامہ اقبال جیسے عظیم محسن ملک و ملت اور یکتائے شاعر و عالم و مفکر کے خلاف بدعملی کے فتوے دینے لگ جائیں۔ مولانا شبلی نعمانی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی مولانا سلیمان ندوی مولانا سید انور شاہ مولانا محمد علی جوہر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا ابوالحسن ندوی اور دوسرے بڑے علماء دین سُنّتِ رسولؐ کے حرفاً اور معناً جاننے اور ماننے والے تھے وہ اقبال کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے اقبال کی خدمات کو سراہا اور کلام اقبال کو جی بھر کے خراج تحسین ادا کیا۔ ان بزرگوں کے سامنے سردار عبدالقیوم کی کیا علمی و عملی حیثیت ہے وہ آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کے صدر ہیں۔ اپنی اسی حیثیت پر توجہ دیں اور اپنے عوام کی واقعتاً عملاً خدمت کریں۔ وہ اپنے "حساس" سیاسی مقام کا بیوں ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں کہ علامہ اقبال کے خلاف الزام و دشنام کی مہم چلا کر ملک و قوم کو ایک نئے فتنے میں مبتلا کر دیں۔

اہل جموں وکشمیر سے استدعا

مناسب ہے کہ آزاد جمّوں وکشمیر کے عوام اپنی ریاست کی آزادی کے سلسلے میں علاّمہ اقبال کی زندگی بھر کی خدمات کو یاد رکھیں۔ اقبال کشمیری خاندان سے تھے۔ کشمیر آتے رہتے تھے۔ ان کی کئی خوبصورت نظمیں کشمیر میں لکھی گئیں۔ وہ کشمیر کے حالات سے پوُری طرح باخبر تھے۔ ریاستی حکومت ہمیشہ ہی مسُلمانوں پہ ظلم ڈھاتی تھی مگر ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں ڈوگرہ سپاہیوں کی گولیوں سے اکیس مسُلمانوں کی شہادت نے قیامت برپا کر دی۔ پوُرے ملک میں مسلمانوں نے یوم کشمیر منا کر احتجاج کیا۔ لاہور کے جلسۂ عام کی صدارت علاّمہ اقبال نے کی اور واشگاف الفاظ میں کشمیری مسُلمانوں کے حقوق کی حمایت کی اور فرمایا کہ "بادشاہی خریدنے سے نہیں چل سکتی"۔ یہ اشارہ تھا اس تاریخی ظلم کی طرف جو انگریز نے گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ ریاست کو بیچ کر کیا تھا۔

اقبال نے کشمیر کے مظلوم مسُلمانوں کے لیے چندہ جمع کرایا اور بعض اچھّے وکیلوں کو قانونی امداد کے لیے کشمیر بھیجا لیکن انہیں ریاست کی حدوُد پر ہی روک دیا گیا۔ خود اقبال کا ریاست میں داخلہ بھی ممنوع تھا اور یہ پابندی ان کی وفات تک رہی۔ ایک ہندو اخبار نے یہ افواہ اڑائی کہ اقبالؒ راجہ ہری سنگھ کے وزیر بننا چاہتے ہیں۔ اقبال نے لاہور کے اسی بھرے جلسے میں فرمایا کہ وہ ایسے حاکم کی وزارت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ پھر ایک بیان میں یہ ارشاد کیا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ممبر ہوتے ہوئے ان کا کشمیری حکومت میں وزیر ہونا دیانت و امانت کے خلاف ہے۔[۱۱۲]

۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" چھپا اقبال نے شاہ ہمدان کے حضور کشمیر کی فروخت کے سانحۂ عظیم پر ایک درد بھرے مرثیے میں عرض کیا ہے ؎

دہقاں وکشت وجوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند چہ ارزاں فروختند

آزاد جمّوں وکشمیر کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ سردار عبدالقیوم کو اقبال کے بارے میں اور

ان کے اپنے منصب صدارت کے متعلق سُنّتِ رسول ؐ کے صحیح تقاضوں سے آگاہ کریں۔ عوام یقیناً اتنے "مقامی" اور "ریاستی" نہیں ہیں کہ وہ اس مسئلے میں حق اور ناحق کی تمیز نہ کر سکیں گے اور صورتِ حال کے مضر مضمرات سے باخبر نہ ہوں گے۔ کیونکہ سردار عبدالقیوم کا یہ کہنا کہ علامہ اقبالؒ بداعمال ہیں۔ ایسا فعل ہے کہ اس کو آگے بڑھایا جائے تو ہر وہ مسلمان جو ظاہری سُنّت کا پیرو ہے یعنی داڑھی رکھتا ہے اور نماز روزے کا پابند ہے ہر اس مسلمان کو۔ جو داڑھی نہیں رکھتا اور نماز روزے کا پابند نہیں، کھلے عام بداعمال کہنے پر مجبور ہے۔ یہ فارمولا اتنا خطرناک ہے کہ اس پر عمل کرنے سے گھر گھر گلی گلی نگر نگر شہر شہر فساد پھیلے گا۔ داڑھی نہ رکھنے والوں اور نماز نہ پڑھنے والوں کی اصلاح کے بہتر طریقے بھی بزرگوں نے استعمال کئے ہیں اور حیرت انگیز کامیابیوں کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ یہ ظاہری سُنّت کی پیروی نہ کرنے والوں اور نماز روزے کی پابندی نہ کرنے والوں کو بداعمالی کی گالی دینے کا فارمولا جو سردار عبدالقیوم نے ایجاد کیا ہے غلط اندیشی پر مبنی ہے اور فتنہ و فساد پر منتج ہوگا۔

خیرِ کثیر اور طلبِ شہادت

سردار عبدالقیوم نے سُنّتِ رسولؐ کی بات کی تھی اس لیے سُنّت رسولؐ کی بات ہوتی رہی ان کا کتاب اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اللہ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے۔

وقولوا للناس حسنا واقیموا الصلوٰۃ و اتوا الذکوٰۃ

یعنی اور کہو لوگوں کے لیے اچھا اور قائم کرو نماز اور دو زکوٰۃ۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہاں لوگوں کے لیے اچھا کہنے کے حکم کو نماز اور زکوٰۃ کے حکم پر سبقت ہے اور اس سلسلے میں مسلم غیر مسلم کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔

پھر سورہ النحل میں ارشاد باری ہے۔

"وجادلھم بالتی ھی احسن"۔ یعنی اور بحث کرو ان سے جس طرح کہ وہ بہتر ہو۔

سردار عبدالقیوم ڈاکٹر جاوید اقبال سے بحث کرتے ہیں تو علامہ اقبال کی ذات تک جا

پہنچتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ بیٹا "ناخلف" ہے اور باپ "ناسلف" تھا۔

پھر سردار عبدالقیوم " ایک قائداعظمؒ نہیں ہزار قائداعظمؒ ہوتے "کہہ کر سمجھاتے ہیں کہ قائداعظمؒ لا الہ الا اللہ سے بے بہرہ تھے اور کلمہ طیبہ کی ساری برکت ان کی ذات کے باہر سے آئی ہے۔ لاحول ولاقوۃ!

یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے راقم ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ پشاور کے حافظ محمد ادریس (جو پی آئی اے کے قاہرہ کے نزدیک حادثے میں جاں بحق ہوئے) ہمارے دینیات کے پروفیسر تھے۔ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے اور ملکی سیاست میں مسلم لیگ کے خلاف تھے۔ انہوں نے ہر مہینے میں ایک دن دینی وغیر دینی ہر طرح کے سوالات کے لیے مختص کر رکھا تھا ایک دن ایک طالب علم نے جو کانگرس کا حامی تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے خلاف توہین آمیز کلمات کہے۔ اس پر حافظ محمد ادریس نے انہیں ٹوکا اور کہا۔" میں خود مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کے حق میں نہیں ہوں لیکن میں جناح صاحب کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا کیونکہ ایک دوست کے واسطے سے جو میری نظر میں بہت معتبر ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک بات، مجھ تک پہنچی ہے یہ انہوں نے اس وقت فرمائی جب ایک شخص نے ان کی مجلس میں محمد علی جناح کے خلاف کچھ کہا۔ فرمایا۔

"جناح کو بُرا نہ کہو۔ ہم نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں دیکھا ہے۔ وہ صالحین میں سے ہے۔"

راقم کو یاد ہے کہ اس نے یہ تین چھوٹے چھوٹے فقرے فوراً اپنے سامنے کھلی ہوئی نوٹ بک میں لکھ لیے تھے۔

اقبال علم وادب اور دین وسیاست کے وہ حسین وشوخ وشاداب پھول تھے جو اسلام کے دینی وفکری پیوند سے برصغیر کی شاخ پر کھلا اور اس لاثانی پھول کی خوشبو ابدی ہے کیونکہ اس کا نفس نفیس حضور رسالت مآبؐ کی محبت سے معطر ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مولانا ابوالحسن ندوی کی کتاب "نقوشِ اقبال" کے حوالے سے کہتے ہیں۔

"علمائے کرام کو اقبال کے سمجھنے کی کوشش کرنا خود ان کے لیے نہایت

ضروری اور نیک فالی ہے اس لیے کہ اب مذہب اور زندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق و سباق میں کی جائے گی جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔"[۱۱۳]

"اقبال کا کلام ہمارے لیے اس صدی کا علمِ کلام ہے جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا اِس لیے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے اسلامی عقائد شعائر اور روایات کی جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے۔ ایسی صحت مند اور بامقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علمِ کلام کے حصّہ میں آیا ہو۔"[۱۱۴]

"کبھی کبھی تو یہاں تک خیال آیا ہے کہ ہم پر عام طور سے آج مذہب کا جو اثر ہے بالخصوص ان پر جو مذہب کو اتنا اعتقاد سے نہیں جتنا عقل سے دیکھنے پرکھنے کے شائق ہیں، وہ براہِ راست اتنا مذہبی تصانیف کا نہیں ہے جتنا اقبال کے اس کلام کا جس میں مذہب، اخلاق اور تاریخ کے تقاضوں کی طرف رہبری ملتی ہے! . . . . اقبال کا کلام اس صدی کا علمِ کلام ہے . . . ."[۱۱۵]

لاہور میں سردار عبدالقیوم نے بدعملی کی دو تعبیریں کیں۔ ایک عام تعبیر چوری ڈاکہ وغیرہ کے معنوں میں دوسری خاص تعبیر ذکر میں کمی یا کوتاہی کے معنوں میں راولپنڈی میں انہوں نے بدعملی کی ایک تیسری تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ "مسلسل ترکِ خیر" بدعملی ہے۔ باریش مسنون چہرہ اور باقاعدہ نماز روزہ بھی خیر کی صورتیں ہیں لیکن ایک شے ہے جسے حکمت کہتے ہیں وہ اللہ کا اپنے بندے پر بڑا انعام ہوتی ہے اور دین و دنیا کے اسرار و رموز اس پر کھولتی ہے۔ اللہ سورہ البقرہ میں فرماتا ہے۔

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔

یعنی وہ دیتا ہے حکمت جسے چاہتا ہے اور جس کو حکمت مل گئی۔ پس مل گئی اسے خیر کثیر۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ سید سلیمان ندوی نے اقبالؒ کو "حکمت و معرفت کا دانا اقبال" کہہ کر یاد کیا۔ ان کے نزدیک کلامِ اقبال "مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے"۔ . . . حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اس کے دامن بھرے ہیں۔" . . . . "خیالات میں رفعت اسرار الٰہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی" . . . . . . "اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا . . . . وہ حکیم جو اسرار کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے . . . ."

سید سلیمان ندوی مزید فرماتے ہیں۔

"حضرت اقبال کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے اور "ان من الشعر لحکمۃ" کے خلعت نبویؐ سے سرفراز ہو چکی ہے" . . . "وہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریلِ امین کا پیام ہے"۔

اقبال کے ہزارہا مداح انہیں حکیم الامّت کہتے ہیں یعنی یہ مانتے ہیں کہ اللہ نے انہیں حکمت کی خیر کثیر سے نوازا تھا۔ اقبال خود بھی اس انعام سے آگاہ تھے جو اللہ نے ان پر کیا تھا۔ "اسرار خودی" کے بارے میں ۱۴ر اپریل ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خط میں لکھا۔

"قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے۔ میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے"۔ [۱۱۶]

اسی خط میں اقبال نے خواجہ حسن نظامی اور دوسرے لوگوں کی مخالفت کی طرف اشارہ کیا۔

"نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مُردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے اُگے گا ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے الحمدللہ"۔ [۱۱۷]

اقبال ۱۹۱۷ء میں "رموزِ بے خودی" مکمل کر چکے تو "حیات مستقبلہ اسلامیہ" کا موضوع ذہن میں آ رہا تھا۔ مولانا گرامی کو اس سلسلے میں لکھا۔

"حیات مستقبلہ اسلامیہ یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعتِ اسلامیہ جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصہ کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں"۔[۱۱۸]

اقبال کی بڑی خواہش اور کوشش تھی کہ انہیں مالی پریشانیوں سے نجات ملے اور وہ یکسوئی کے ساتھ قرآن مجید پر اپنی کتاب لکھ سکیں۔ ۱۹۳۵ء میں سید راس مسعود کے نام خط میں انہیں یقین دلایا کہ یہ "ایک بے نظیر کتاب" ہوگی اور فرمایا۔

"یہ جدید اسلام کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں۔ جب یہ کہتا ہوں کہ آج دنیائے اسلام میں میں ہی واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں"۔[۱۱۹]

اقبال کے ان دعووں کی دلیل ان کا وہ شعری و نثری کارنامہ وہ عظیم میراث ہے جس پر برصغیر کا مسلمان بالخصوص اور دنیا بھر کا مسلمان بالعموم فخر کر سکتا ہے اور یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ آج کے عالم اسلام کا اگر کسی ایک مسلمان شخصیت پر بہ حیثیت دین حق کے بہترین ترجمان کے اتفاق اور اجماع ہو سکتا ہے تو وہ اقبال ہیں!

مولانا حسرت موہانی برصغیر کی ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔ آزادی کے ہراول دستہ کے شہسوار، سرکردہ مسلم لیگی رہنما، رئیس المتغزلین، ظاہر شریعت سے آراستہ، باطن طریقت سے پیراستہ، عالم، صوفی، درویش، پارسا، ایک سادہ جوڑا زیب تن دوسرا دھلا ہوا

بغل میں رکھتے تھے اور بس ! اقبال سے عجیب تعلق خاطر تھا۔ ان کی رحلت کے "حادثۂ عظیم" پر دُعا کی کہ "اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے" اور پھر یوں خون کے آنسو روئے ؎

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لیے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

مولانا سید ابوالحسن ندوی برصغیر کی سیاست میں اقبال کے تصورِ پاکستان اور مسلم لیگ کے حامی نہ تھے لیکن ابتدا ہی سے اقبال کے شیفتہ اور گرویدہ تھے اور آج تک ہیں۔ ۱۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں یہاں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔

"یہ اگر اقبال کا چمن ہے تو میں بھی اس کا بلبل ہوں اور مجھے اس چمن کے کسی بھی شاخسار پہ بیٹھنے کا حق ہے"۔[۱۲۱]

یہ سُنّتِ مطہرہ کے ظاہر داروں اور سوداگروں کی آوازیں نہیں سُنّتِ مطہرہ کے عاشقوں اور شیدائیوں کی سرحد پار سے آنے والی آوازیں ہیں !

اصل میں یہ دل والوں کا ٹولہ ہے۔ دنیا انہیں پستیوں کی طرف کھینچتی ہے مگر ان کی نظر بلندیوں پر رہتی ہے۔ انسان ہیں کبھی کبھی ڈگمگا اور لڑکھڑا بھی جاتے ہیں مگر سچے کھرے اور پکے ہوتے ہیں۔ گرتے گرتے بھی سنبھل جاتے ہیں ؎

یارب ! یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
(بالِ جبریل)

کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں میں !
ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں نہیں بس کا مرے کارِ زمیں
ابلۂ دنیا ہے کیوں دانائے دیں

(بالِ جبریل)

دل خود را بدست کس نہ دادم
گرہ از روئے کار خود کشادم
بہ غیر اللہ کردم تکیہ یک بار
دو صد بار از مقام خود فتادم

(ارمغانِ حجاز)

وکالت کی آمدنی سے ضروریات پوری نہ ہوتی تھیں۔ اس پریشانی کے سبب اقبال برسوں امتحانوں کے پرچے بناتے اور جانچتے رہے[۱۲۲]۔ بعض موقعوں پر کسی معقول آمدنی والی جگہ کے لیے خواہش اور کوشش بھی کی پھر محسوس کیا کہ توکل کے باب میں چوک گئے تو روحانی نقصانات کے اعتراف سے گریز نہ کیا۔ احتیاط ہمہ وقت پیشِ نظر رہتی۔ بعض موکل مقدمات کی پیشی کے لیے آتے تو پھل پھول یا مٹھائی لے آتے۔ یہ تحفے طے شدہ فیس کے علاوہ ہوتے اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے۔ اقبال نے سید سلیمان ندوی سے دریافت کیا "کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے؟"[۱۲۳]

سید راس مسعود کی مساعی سے ریاست بھوپال نے اقبال کے لیے وظیفہ لگا دیا تو انھوں نے ریاست حیدر آباد سے بھی التفات کے لیے کوشش شروع کی۔ اقبال نے انہیں روک دیا۔ فرمایا کہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ میری ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں"۔[۱۲۴]

اس استغنا کی شان اور قناعت کے رنگ پر حیرت ہوتی ہے۔ لوگ انہیں سلطنتِ برطانیہ کا مفلس ترین نائٹ کہتے تھے[۱۲۵] کیا "شاہ گدا نما" تھے! ؎

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

(بالِ جبریل)

پُرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

(بالِ جبریل)

چھوٹے کھوٹے اور کچے لوگ دوسروں سے اعمال کا حساب مانگتے ہیں سچے کھرے اور پکے لوگ خود اپنے آپ پر شہادت طلب کرتے ہیں کیونکہ یہی سنتِ رسولؐ ہے۔[126]

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ایک دن اقبالؒ نے اپنے والد مکرم سے جو مرض الموت میں مبتلا تھے پوچھا "والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں"؟ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ "جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا"۔[127]

یہی نہیں اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ سے بھی پوچھا کہ انہوں نے اس کی صدیوں کی غفلت اور غلامی کا افسوں توڑا یا نہیں؟ ؎

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

(ضربِ کلیم)

اور ساری ہی ملتِ اسلامیہ نے مشرق و مغرب سے شہادت دی کہ اقبالؒ کے آوازۂ حق اور نعرۂ عمل نے اس کو دینی حمیت و غیرت اور آزادی و خود مختاری کی دولت بخشی تھی۔ یہ اللہ کی شان عطا ہے جسے جو چاہے دے دے جو چاہے بنا دے۔

یہاں وہی الفاظ دُہرانے کو جی چاہتا ہے جو سیّد سلیمان ندوی نے اقبالؒ کی وفات پر ان کو "معارف" سے رخصت کرتے وقت کہے تھے۔

سلام اللہ علیک ورحمتہ الی یوم التلاق

(سلام ہو اللہ کا تم پر اور رحمت اس کی ملاقات کے دِن تک)

حواشی

سردار عبدالقیوم کی مندرجہ ذیل تقریریں یہاں زیر بحث آئی ہیں؛

ا۔ ناروے کی وہ دو تقریریں جن میں انہوں نے اقبال اور کلام اقبال پر حرف زنی کی ہے اور جو روزنامہ نوائے وقت لاہور (۲۴ دسمبر ۱۹۸۷ء) اور روزنامہ جنگ لاہور اشاعت خصوصی (۲ جنوری ۱۹۸۸ء) میں چھپی ہیں۔

ب۔ "جنگ" فورم لاہور میں ان کی وہ تقریر جو روزنامہ جنگ لاہور اشاعت خصوصی (۲ جنوری ۱۹۸۸ء) میں چھپی ہے۔

ج "میٹ دی پریس" پروگرام راولپنڈی میں ان کی وہ تقریر جو روزنامہ نوائے وقت لاہور (۱۲ جنوری ۱۹۸۸ء) میں چھپی ہے۔

ان تقریروں سے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان کے حوالے ان کے آخر میں اس طرح دیے گئے ہیں ناروے ۱، ناروے ۲، لاہور ۳، راولپنڈی ۴۔

۱۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۵ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۴ک ۴۔

۲۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) ۱۹۸۱ء از جاوید اقبال۔ ص ۲۲۔

۳۔ کتاب مذکور ۔ ص ۲۳
۴۔ اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات (انگریزی) مرتبہ لطیف احمد شروانی ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۔
۵۔ خطوطِ اقبال بنام جناح (انگریزی) ۱۹۴۳ء ص ۱۹
۶۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ حصہ دوم ۔ ص ۲۵۷
۷۔ قول، صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول ص ۳۸۳
۸۔ اقبال نامہ حصہ اول ۔ ص ۸۰
۹۔ خطوط مشاہیر مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ ص ۲۷۴
۱۰۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول ۔ ص ۲۴۱، ۲۴۲
۱۱۔ اقبال اور علمائے پاک و ہند از اعجاز الحق قدوسی ۱۹۷۷ء۔ ص ۲۷۱
۱۲۔ اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں، مرتبہ اختر راہی ۔ ص ۵۱
۱۳۔ کتاب مذکور ۔ ص ۶۱
۱۴۔ کتاب مذکور۔ ص ۶۵
۱۵۔ کتاب مذکور ۔ ص ۷۲
۱۶۔ کتاب مذکور۔ ص ۷۹، ۸۰
۱۷۔ کتاب مذکور ۔ ص ۱۱۶، ۱۲۰
۱۸۔ اردو ادب ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۲
۱۹۔ اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں ۔ ص ۱۱۲، ۱۱۳
۲۰۔ نقوشِ اقبال از سید ابوالحسن ندوی ۔ ۱۹۷۹ء۔ ص ۳۹
۲۱۔ کاروان زندگی از سید ابوالحسن ندوی ۔ ص ۱۷۴، ۱۷۵
۲۲۔ نقوش اقبال ۔ ص ۴۰

۲۳۔ کتاب مذکور۔ ص ۴۱

۲۴۔ کتاب مذکور۔ ص ۴۱، ۴۲

۲۵۔ کتاب مذکور۔ ص ۶۰، ۶۱

۲۶۔ کتاب مذکور۔ ص ۶۵

۲۷۔ کتاب مذکور۔ ص ۶۷

۲۸۔ زندہ رود (حیاتِ اقبال کا اختتامی دور) ص ۱۷۹

۲۹۔ کتاب مذکور۔ ص ۱۸۰

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ محمد اقبال؛ ان کی سیرت اور فلسفہ اور شعر (عربی) از عبدالوہاب عزام ۱۹۷۲ء ص ۱۸

۳۲۔ ماہنامہ سیارہ لاہور فروری مارچ ۱۹۷۸ء ص ۷۴۔۷۵

۳۳۔ روائع اقبال (عربی) از سید ابوالحسن ندوی ۱۹۸۱ء ص ۴۶، ۴۷ مزید دیکھیے زندہ رود (حیات اقبال کا اختتامی دور) ص ۳۲۰

۳۴۔ سیر افغانستان از سید سلیمان ندوی۔ ص ۱۷۹، ۱۸۰

۳۵۔ اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں۔ ص ۵۱، ۵۲

۳۶۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) ص ۴۰

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ کتاب مذکور۔ ص ۴۸، ۴۹

۳۹۔ کتاب مذکور۔ ص ۴۱، ۴۲

۴۰۔ کتاب مذکور۔ ص ۲۳۴۔ شاہ نادر شاہ کی والدہ کی ولادت لاہور میں ہوئی تھی اور لاہور میں رہائش پذیر بھی رہیں۔ نادر شاہ ڈیرہ دون کے پڑھے ہوتے تھے

اور بڑی اچھی اردو بولتے تھے۔ دیکھیے۔ ص ۲۳۲

۴۱۔ کتاب مذکور۔ ص ۲۳۵۔

۴۲۔ اقبال (جیسا میں نے انہیں پایا) (انگریزی) ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۰

۴۳۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۷ ک ۷۔ مزید دیکھیے نوائے وقت میگزین۔ ۲۲ جولائی ۱۹۸۸ء پدرم کسان بود از میاں محمد شفیع۔ ص ۷ ک ۵

۴۴۔ اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی ۱۹۷۱ء ص ۱۲۵، ۱۲۶، ۲۱۷، ۲۳۰، ۳۱۷۔

۴۵۔ مکتوباتِ اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی ۱۹۷۷ء ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

۴۶۔ اقبال اور علمائے پاک وہند از اعجاز الحق قدوسی۔ ص ۳۸۱، ۳۸۲

۴۷۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ ص ۱۶۷، ۱۷۰

۴۸۔ قادیانیت شائع کردہ رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) ص ۳۲

۴۹۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) ص ۱۶۹، ۱۸۱

۵۰۔ مظلوم اقبال از اعجاز احمد ۱۹۸۵ء ص ۱۷۵، ۱۷۷

۵۱۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۲ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۷ ک ۳

۵۲۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲ جنوری ۱۹۸۸ء۔ اشاعت خصوصی

۵۳۔ شریعت و طریقت از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان ستمبر ۱۹۸۷ء، ص ۶۱۔

۵۴۔

۵۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (فیروز سنز) جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۷۹، ۱۳۰

۵۶۔ تاریخ الامت از محمد اسلم جیراجپوری جلد اول ص ۲۲۱

۵۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ص ۱۰۸

۵۸۔ تاریخِ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی حصہ اول ۔ ص ۹۷

۵۹۔ تاریخ الامت جلد اول ص ۲۲۶

۶۰۔ تاریخِ اسلام حصہ اول ص ۱۳۶

۶۱۔ کتاب مذکور ص ۱۵۱

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ تاریخ الامت جلد دوم ص ۷۴، ۷۵

۶۴۔ کاروان زندگی از سید ابوالحسن ندوی ص ۳۴۷

۶۵۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۲۲۶، ۲۲۷

۶۶۔ کتاب مذکور ص ۲۲۹

۶۷۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مرتبہ سید سعید احمد ص ۱۰۱

۶۸۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۲۳۱، ۲۳۲

۶۹۔ کتاب مذکور ص ۲۳۹

۷۰۔ کتاب مذکور ص ۲۴۱، ۲۴۲

۷۱۔ کتاب مذکور ص ۲۴۲

۷۲۔ کتاب مذکور ص ۱۹۰۔ مزید دیکھیے منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین از سید ابوالحسن ندوی (لاہور ۱۹۷۶ء) ص ۱۳۲

۷۳۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۱۹۰

۷۴۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ص ۴۵

۷۵۔ کتاب مذکور ص ۴۵، ۴۶

۷۶۔ کتاب مذکور ص ۵۱، ۵۲

۷۷۔ کتاب مذکور ص ۵۱

۷۸۔ کتاب مذکور ص ۵۰، ۵۱

۷۹۔ کتاب مذکور ص ۱۴۹، ۱۵۰

۸۰۔ کتاب مذکور ص ۱۵۰، ۱۵۱

۸۱۔ کتاب مذکور ص ۱۵۱

۸۲۔ کتاب مذکور ص ۱۱۰

۸۳۔ تاریخ الامت ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا ص ۱۳۱، ۱۳۲

۸۴۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ص ۱۴۸

۸۵۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا مرتبہ عبدالجلیل قریشی ص ۱۱

۸۶۔ کتاب مذکور ص ۱۷

۸۷۔ کتاب مذکور ص ۲۰

۸۸۔ کتاب مذکور ص ۲۴

۸۹۔ کتاب مذکور ص ۲۹

۹۰۔ کتاب مذکور ص ۳۷

۹۱۔ حضرت علیؓ نے فرمایا مرتبہ شاہدہ بیگم ۱۹۷۸ء ص ۴۵

۹۲۔ کتاب مذکور ص ۴۸

۹۳۔ کتاب مذکور ص ۷۳

۹۴۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۳۶۷، ۳۷۴، ۳۷۵

۹۵۔ کتاب مذکور ص ۳۹۵

۹۶۔ تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۲۱۷

۹۷۔ کتاب مذکور ص ۲۱۷، ۲۱۸

۹۸۔ کتاب مذکور ص ۲۲۹ ،
۹۹۔ کتاب مذکور ص ۲۱۹ ، ۲۲۲
۱۰۰۔ کتاب مذکور ص ۲۲۶ ، ۲۲۷
۱۰۱۔ کتاب مذکور ص ۲۳۵
۱۰۲۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۱۵۷
۱۰۳۔ کتاب مذکور ص ۲۳۶
۱۰۴۔ تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۲۴۹
۱۰۵۔ کتاب مذکور ص ۲۴۸ ، ۲۴۹
۱۰۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ص ۱۳۱ ، ۱۳۲
۱۰۷۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۱۰۹
۱۰۸۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا مرتبہ عبدالجلیل قریشی ص ۴۴
۱۰۹۔ کتاب مذکور ص ۱۹۸
۱۱۰۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ص ۶۷
۱۱۱۔ کتاب مذکور ص ۴۸ ، ۴۹ و حضرت علیؓ نے فرمایا ص
۱۱۲۔ زندہ رود (حیاتِ اقبال کا اختتامی دور) ص ۱۵۱
۱۱۳۔ نقوشِ اقبال ص ۱۴
۱۱۴۔ کتاب مذکور ص ۲۱
۱۱۵۔ کتاب مذکور ص ۲۳
۱۱۶۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) ص ۲۰۲
۱۱۷۔ کتاب مذکور ص ۲۰۳
۱۱۸۔ کتاب مذکور ص ۲۱۰

۱۱۹۔ زندہ رود (حیاتِ اقبال کا اختتامی دور) ص ۱۱۹

۱۲۰۔ نذرِ اقبال مرتبہ ذوالفقار تابش ص ۱۳۱، ۲۹۵، ۲۹۶

۱۲۱۔ حدیث پاکستان از سید ابوالحسن ندوی ص ۱۰۰

۱۲۲۔ زندہ رود (حیاتِ اقبال کا اختتامی دور) ص ۱۱۰، ۲۶۰، ۲۶۱

۱۲۳۔ اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں۔ ص ۱۵۳

۱۲۴۔ زندہ رود (حیات اقبال کا اختتامی دور) ص ۲۶۸

۱۲۵۔ کتاب مذکور ص ۱۲۱

۱۲۶۔ تاریخ اسلام حصہ اول ص ۱۱۰

۱۲۷۔ اقبال، سید سلیمان ندوی کی نظر میں۔ ص ۸۶